مکتبہ چراغِ اسلام
۵/۱ قذافی مارکیٹ ○ اردو بازار ○ لاہور

مکتبہ چراغِ اسلام
5/1 قذافی مارکیٹ ○ اُردو بازار ○ لاہور

کتاب	:	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک
ناشر	:	مکتبہ چراغِ اسلام
مطبع	:	المطبعۃ العصریۃ
تعداد	:	۱۱۰۰
طبعِ ثالث	:	اکتوبر ۱۹۸۹ء
قیمت	:	۳۰/- روپے

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

آج سے کچھ عرصہ پہلے یہ کتاب شائع ہوئی تھی اور اس حال میں کہ کتابت وطباعت کی غلطیوں کی زیادتی کے باعث غریب مؤلف کو ایک معذرت نامہ بھی لکھنا پڑا تھا۔ اللہ تعالٰے کا ہزار ہزار شکر ہے کہ تمام ظاہری و باطنی کوتاہیوں کے باوجود کتاب قبولیت کی نگاہوں سے دیکھی گئی اور خواص وعوام ہر طبقے میں اس کا خیر مقدم ہوا۔

راقم نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ موضوع ابھی بڑی محنت اور تلاش وجستجو کا طالب ہے۔ بدنصیبی سے ان سطروں کا لکھنے والا صحت اور سکونِ خاطر، دونوں نعمتوں سے محروم ہے، جو کام اس نے اپنے ذمہ لے رکھے ہیں، انہیں سے عہدہ برا ہونا مشکل ہو جاتا ہے پھر بھی عاجز نے کوشش کی ہے کہ اس دوسرے ایڈیشن میں پہلی کوتاہیاں نہ رہیں تفصیل کی جگہ ضروری تفصیل کردی جائے۔ جو مقام تشنہ رہ گئے تھے، انہیں مکمل کر دیا جائے اور غیر ضروری نین اور حوالے جو تحقیقی کاموں Research کی خصوصیت ہیں حذف کر دیئے جائیں۔ "املا" اور کتابت میں بھی قواعد کا لحاظ رکھا جائے اور "اوقاف" کی صحت کا بھی احترام کیا جائے ———— نہیں کہہ سکتا کہ عاجز ان کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے؟ بہر حال اگر کوئی خوشگوار تبدیلی اور مفید اضافہ محسوس ہو تو یہ اللہ تعالٰے کے فضل وکرم پر محمول کیا جائے۔ ورنہ مؤلف کی کوتاہی سمجھ کر عفو

۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں جب راقم نے عربی زبان میں اسلامی ہند کی تاریخ لکھنا شروع کی، تو ہندوستان کی مشہور اور بدنام وہابی تحریک سے ابتدائی واقفیت پیدا ہوئی۔ جو دو چار کتابیں دستیاب ہو سکیں، دیکھیں اور "الحَرَکۃُ الوَہّابیۃِ الہِندیۃ السِّیاسیّۃ" کے عنوان سے زیرِ تحریر تاریخ میں ایک باب کا اضافہ ہو گیا۔ جس کا ایک ٹکڑا مرحوم "الضیاء" کے آخری نمبر (شعبان ۵۴ھ۔ دسمبر ۳۵ء) میں شائع بھی ہوا تھا۔ پھر وہی مقالہ اردو کے لباس میں (وہابیت: ایک اہم دینی و سیاسی تحریک) کی سُرخی کے ساتھ الہلال (پٹنہ) کی متعدد اشاعتوں میں شائع ہوا (اپریل۔ مئی۔ جون ۳۶ء) اور خود اس تحریک کے مرکز عظیم آباد اور خاص کر صادق پوری حلقوں میں بھی تحسین و قبولیت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس سے سمندِ شوق کو ایک اور تازیانہ لگا اور مزید چھان بین جاری رہی۔

حسنِ اتفاق کہ ان ہی دنوں میں محبِ مخلص مولانا ابوالحسن علی ندوی حضرت سیدِ شہید رح کی سیرت مرتب کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس لئے بحث و مذاکرہ کے

له حاضر مسلمی الہند و غابرہم

بعد دو دوستوں کے درمیان یہ طے پایا کہ علی میاں سید صاحب کی سیرت مرتب کریں اور یہ گنہگار مشہد بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) سے اپنا قلمی سفر شروع کرے۔ ان دونوں میں جو علم و عمل کا جامع، مستعد اور سراپا سوز و درد تھا، اس نے اپنا کام جلد ختم کر لیا جس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ ان سطروں کے لکھنے سے بہت پہلے سیرتِ سید احمد شہیدؒ کے دو ایڈیشن نکل کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

اس بے عمل کا دائرۂ عمل نسبتاً الجھا ہوا اور پُرخطر بھی تھا۔ حکومتِ وقت کے خوف سے معاصر اور آزاد باخبر حلقوں نے کوئی یادداشت محفوظ نہیں رکھی۔ اور تو اور صادق پور میں بھی کوئی معقول تحریری مسالہ موجود نہیں۔ سننے اور دیکھنے والے آنکھیں بند کر چکے اور ایک آدھ واقفِ کار نظر بھی آئے، تو پہلی سختیوں کا رُعب دل پر اب تک بیٹھا ہوا۔ عظیم آباد پٹنہ میں سات سال مسلسل قیام (سنہ ۳۸ء سے ۴۵ء) اور ایک مشہور اور قیمتی کتاب خانے (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ) کی تمام آسانیوں کے باوجود مواد کے فراہم اور تلاش کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور سات آٹھ سال کی مسلسل جدوجہد کے باوجود بعض گم شدہ کڑیوں کا سراغ اب تک نہیں مل سکا۔ مجبوری میں جو کچھ ہو سکا، حاضرِ خدمت ہے۔ مزید چھان بین کا سلسلہ جاری ہے اور رہے گا۔ اللہ نے چاہا تو دوسرے ایڈیشن میں یہ کوتاہیاں دور ہو جائیں گی۔

۲

حضرت سید شہیدؒ کی تحریکِ تجدید و جہاد یا ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک عام طور پر وہابی تحریک کے نام سے یاد کی جاتی ہے اور اپنوں اور غیروں، تمام حلقوں میں یہ کوشش کی جاتی رہی ہے کہ نجد کی دعوتِ توحید و اصلاح سے اس کا ڈانڈا ملا دیا جائے۔ ہر چند کہ دونوں تحریکوں کا سرچشمہ (کتاب و سنت) ایک ہے اور رجحانات بھی ملتے جلتے ہیں، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ دونوں کی نشوونما الگ الگ ہوئی اور ایک پر دوسرے کا کوئی اثر

نہیں پڑا۔ اس تحریک کے مطالعے کے دوران میں نجد کی دعوتِ توحید کے متعلق ایسی غلط بیانیاں بلکہ زہر افشانیاں اور دشنام طرازیاں نظر سے گزریں کہ بارائے ضبط نہ رہا، اور نجد کی دعوتِ تجدید واصلاح نے کچھ عرصے کے لئے توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ زیرِ نظر کتاب سے پہلے دعوتِ نجد کی تاریخ، محمدؒ بن عبدالوہاب ۔ ایک مظلوم اور بدنام مصلحؒ، کے نام سے مکمل ہوگئی۔

گو اس رسالے کا اصل موضوع ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک اور اس میں بھی خاص کر مشہدِ بالاکوٹ کے بعد کے واقعات و حالات کا جائزہ لینا ہے۔ تاہم ربطِ کلام اور دہابی تحریک، نام کی شہرت کے باعث، حضرت سید احمد شہیدؒ کی سیرت اور 'وہابیت' پر دو باب شروع میں بڑھا دئے گئے ہیں۔ ہر چند کہ لفظ 'وہابیت' کا اطلاق دنیا کی کسی تحریک پر صحیح نہیں۔ نجد کی دعوت کے علَم بردار، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کی طرف اگر نسبت کرنا ہو، تو محمدی کہنا چاہیئے۔ علاوہ بریں اِن کے ماننے والے عام طور پر اپنے آپ کو 'حنبلی' کہتے ہیں۔ علمائے حنابلہ کی کتابوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ محمد بن عبدالوہابؒ نے اِن سے زیادہ ایک حرف نہیں کہا۔ البتہ عزم وعمل کی مردہ قوتوں کو بیدار ضرور کیا۔ بے جان پیکروں میں زندگی کی حرارت ڈال دی اور ایک پورے خطے کو اسلامی رنگ میں شرابور کر دیا اور آپ جانتے ہیں، یہ ایسا گناہ ہے، جسے شاطرانِ فرنگ اور ان کے ہواخواہ معاف نہیں کر سکتے۔

نجد کے بعد 'وہابیت' کا لیبل سید شہیدؒ کے ماننے والے ہندوستانی مجاہدوں پر بھی لگایا گیا، جو بار بار کی تردید کے باوجود آج بھی قائم ہے۔ اور یہ "گالی" اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ بعض اچھے خاصے مخلص مسلمان بھی 'مجاہدین' کو 'وہابی' ہی کے نام سے جانتے ہیں اور اس سوختہ سامان نے تو اب تنگ آکر اس لقب (وہابی) سے گھبرانا بھی چھوڑ دیا ہے۔

اچھا صاحب! اگر اللہ کا نام بلند کرنے اور اس کی راہ میں جان و مال کی قربانیوں کا نام 'وھابیت' ہے تو ہم وھابی ہیں۔ چلئے! چھٹی ہوئی ______

کتاب کے آغاز میں وھابیت پر چند صفحے اسی 'عذر' کے ماتحت لکھے گئے ہیں' جو شاید اصحابِ نظر کی نگاہ میں ناقابلِ قبول نہ ہوں۔

(۲)

پچھلے چند برسوں میں جن صاحبوں نے سیّد شہیدؒ اور ان کے ماننے والوں پر کچھ لکھا ہے' ان میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور (ف ۱۳۶۳ھ) اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی طفیل احمد صاحب مصنّف (مسلمانوں کا روشن مستقبل) نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر ان کا زیادہ تر اعتماد مجاہدینِ ہند کے خاص کرم فرما ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر پر رہا ہے۔ مولانا سندھیؒ کی کتاب شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، وسیع مطالعہ اور عمیق فکر کا نتیجہ ہے۔ مگر (اللہ ان کو کروڑ کروڑ جنّت نصیب کرے اور ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے) انہوں نے حزبِ ولی اللہ کی تشکیل اور من مانی توجیہ کی خاطر سیّد صاحبؒ کے ماننے والوں اور خاص کر اہلِ صادق پور پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اور ان کی کمزوریوں کی تنقید و مذمّت میں ان کا قلم اعتدال پر قائم نہیں رہ سکا ہے۔ راقم نے ان کی زندگی ہی میں اس کتاب پر تنقید کی تھی اور اہلِ صادق پور کے صحیح حالات پیش کئے تھے۔ (ملاحظہ ہو — مولانا سندھیؒ اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب (سیرت سیّد احمد شہیدؒ) سیّد صاحب کی سوانح

لہ افسوس کہ ان سطروں کے چھپنے کے بعد مولوی سیّد طفیل احمد صاحب نے بھی دارِ آخرت کی راہ اختیار کرلی۔ (۱۳۶۵ھ) اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

ان کی تعلیمات اور مشن پر بے مثل کتاب ہے اور اب تک اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے سب پر بھاری ہے، مگر افسوس کہ میرے عزیز ترین دوست اور مخلص بھائی کا طریقِ نظر و فکر خالص عقیدت مندانہ ہے اور انہوں نے بزرگوں کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں سے نگاہ بچا کر نکل جانے کی کوشش کی ہے۔

راقم کی روش ان دونوں اصحابِ علم و فضل کے مقابلے میں بین بین کی سی رہی ہے یہ گنہگار سید صاحب رح کی تحریکِ تجدید و جہاد کو "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" سمجھتا ہے۔ اور مولانا سندھی رح کی طرح ان کی دعوت کو ـــ کسی اندرونی یا بیرونی تحریک کا ضمیمہ نہیں خیال کرتا اور نہ انہیں کسی امیرِ جماعت کا لفٹیننٹ یا کمانڈر انچیف تصور کرتا ہے۔ دوسری طرف جیسا کہ زیرِ نظر صفحات کے مطالعے سے واضح ہوگا، سید صاحب رح یا ان کے اصحابِ خاص کو معصوم بھی نہیں سمجھتا۔ نیز مستقبل میں ماضی کی غلطیوں سے بچنے کے لئے پچھلی فروگذاشتوں کی نشاندہی ضروری خیال کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقِ فکر بہت کم لوگوں کو خوش کر سکے گا اور بہت ممکن ہے کہ اس کی مخالفت میں آوازیں بھی بلند ہوں ان "خطرات" کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس گنہگار نے جابجا جائز اور بے لاگ تنقید کرنے کی جرأت کی ہے اور یہ صرف اس خیال کے ماتحت کہ حق بات بہر حال کڑوی معلوم ہوتی ہے اور اگر کوئی پائیدار لٹریچر اور صالح فضا تیار کرنا ہے، تو پھر پسندِ عام کی خاطر حق کے اظہار میں تأمل نہ ہونا چاہیئے۔ نیتوں کا حال اللہ تعالٰے بہتر جانتا ہے۔

آخر میں ایک حرف مآخذ سے متعلق بھی عرض کر دوں۔ راقم کی یہ کوشش رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ معاصر شہادتوں اور اصلی (Original) مآخذ سے کام لیا جائے۔ کتاب شروع کرنے سے پہلے آخری باب کتابیات (Bibliography) پر نظر ڈال لی جائے تو بین السطور تنقیدوں کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اس کتاب ۔۔۔ کی تیاری میں جن قیمتی کتابوں، رپورٹوں، سرکاری دستاویزوں

اور علمی ذخائر سے فائدہ اُٹھانے کا موقع مِلا ہے۔ ان تک اس بے برگ و بے نوا طالبِ علم کی رسائی مشکل تھی، اگر بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کی عنایت اور معاونت نہ ہوتی۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ جن "بزرگ" نے قیمتی کاغذات کی فراہمی میں سب سے زیادہ مدد دی ہے انہوں نے اصرار کے باوجود نام ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بہر حال یہ حقیر اُن تمام اہلِ علم کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہے اور توقّع رکھتا ہے کہ یہ عنایتیں جاری رہیں گی۔ نیز اہلِ علم و اربابِ نظر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ حقیر کی کوتاہیوں اور لغزشوں پر متنبّہ کرنے میں مطلق تأمّل نہ فرمائیں۔

یہ کج مج رقم اپنی طالب علمانہ حیثیت اور کم علمی سے خوب واقف ہے۔ ہر مفید مشورہ شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ اور تو اور معاندانہ تنقیدوں سے بھی کام کی بات مِل سکی، تو اظہارِ امتنان کے ساتھ اُخذ کی جائے گی۔

مخدومی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی راقم کے اور اس کتاب کے تمام ناظرین کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ازراہِ عنایت مسوّدہ پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارہ کی اور مفید مشوروں سے سرفراز کیا۔ نیز برادرِ عزیز جناب میاں طفیل محمد صاحب قیّم جماعتِ اسلامی کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے قانونی اصطلاحات کی توضیح اور تفہیم میں راقم کی مدد کی۔

عاجز
مسعود عالم ندوی

پہلا باب

وہّابیّت کیا ہے؟

"وہابیت" کی نسبت عام طور پر شیخ الاسلام محمدؒ بن عبدالوہاب بن سلیمان نجدی کی طرف کی جاتی ہے شیخ کی ولادت ۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء میں ہوئی۔ ان کی نشو ونما اور تربیت صحرائے عرب ہی میں ہوئی۔ تحصیلِ علم کے لئے مدینہ منورہ اور بصرہ تک کے سفر کئے۔ ان کی ولادت کے وقت یعنی بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ دین کے ہر شعبہ میں نجد و عرب کے کلمہ گو انحطاط پذیر تھے۔ اور ایک نجد و عرب پر ہی کیا موقوف ہے، ساری اسلامی دنیا شرک و بدعات کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ کوئی سیاسی شعور باقی نہیں رہا تھا، جہاں کچھ طاقت تھی، وہاں ملوکیت کا دور دورہ تھا۔ یہ حالات دیکھ کر محمدؒ بن عبدالوہاب کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی۔ بالکل نوجوانی ہی میں اصلاح و تجدید کی دعوت دینا شروع کی۔ اپنے گرد و نواح کے مسلمانوں کو کتاب و سنّت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اور اس سلسلے میں ہر طرح کی اذیتیں برداشت کیں۔ تکلیفیں سہیں۔ پہلے بوڑھے باپ ہی کی خفگی برداشت کرنا پڑی۔ پھر اپنے آبائی وطن عیینہ سے نکلنے پر مجبور کئے گئے۔ آخر چند برسوں کے ابتلاء کے بعد درعیہ (نجد) کے امیر محمد بن سعودؒ

(ف ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵ء) کے ہاں پناہ ملی۔ امیر اور اس کے وزیر دعوتِ توحید کے سرگرم حامی بن گئے اور ان کی مدد اور معاونت کے بل پر شیخ الاسلام نے تبلیغ اور زوروں پر شروع کر دی تا آنکہ کامیابی اُن کے قدم لینے لگی۔ شمعِ توحید کے پروانے اطراف و اکناف سے آ آ کر شیخ الاسلام کے حلقۂ درس میں حاضر ہوتے اور پھر لوٹ کر اپنے اپنے علاقوں میں اللہ کا پیغام پہنچاتے۔

محمدؒ بن سعود کی وفات ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵ء میں ہوئی اور اس کا بیٹا عبدالعزیز بن محمدؒ بن سعود تاج و تخت کا مالک ہوا۔ عزم و ہمت میں یہ اپنے باپ سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ بڑھا چڑھا ہوا تھا اور اس کے زمانۂ حکومت میں 'دعوت' کی توسیع اور تبلیغ میں بڑی ترقی ہوئی۔ خود شیخ الاسلام بنفسِ نفیس عام تبلیغی کاموں کی دیکھ بھال کرتے۔ امیر عبدالعزیز صرف ایک مطیع شاگرد کی طرح ان کے احکام اور ہدایتوں کی تعمیل کرتا۔ شیخ نے ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء میں بانوے سال کی عمر پا کر وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے تبلیغ و دعوت کا فریضہ سرگرمی کے ساتھ ادا کرتے رہے دوسری طرف امیر عبدالعزیز برابر اپنا دائرۂ حکومت وسیع کرتا رہا تا آنکہ نجد کا پورا علاقہ اس کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ حجاز پر بھی چڑھائی کی، اور مکہ معظمہ پر اس کا عارضی قبضہ بھی ہو گیا۔ پھر ترکوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔ امیر عبدالعزیز درؔ کی جامع مسجد میں نماز پڑھاتے ہوئے ایک ایرانی شیعہ کے ہاتھوں شہید ہوا (۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء) اور اسی سال اس کا بیٹا سعود بن عبدالعزیز بن محمد مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخل ہوا۔ اور حرم کو شرکت و بدعت کی آلودگیوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد اہلِ نجد کے حوصلے بڑھ گئے۔ ان کی نگاہیں شام کی طرف اٹھنے لگیں اور تمام دنیائے اسلام کو دعوتِ توحید سے آشنا کرنے کا خیال ان کے دلوں میں گدگدی پیدا کرنے لگا۔ ان کی دینی غیرت اور قومی شجاعت کامیابی کی ضمانت تھی۔ شام اور عراق کے علاقوں پر کئی کامیاب حملے بھی کئے، لیکن خلافت کے علَم بردار قسطنطنیہ کے عرش نشین ترک عربوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھنا کب گوارا کر سکتے تھے؟ انہوں نے مقابلہ سے خود تنگ آ کر محمدؒ علی پاشا، خدیوِ مصر سے امداد طلب کی۔ ترک (ترکی، مرکزی حکومت، آستانہ) محمد علی پاشا کے بڑھتے

ہوئے اقتدار سے الگ خائف تھے۔ انھوں نے "سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے" پر عمل کرتے ہوئے، محمد علی کو نجدیوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ چند سالوں کی مسلسل اور خوں ریز جنگوں کے بعد نجدیوں کو شکست ہوئی۔

سعود بن عبدالعزیز کی وفات ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء میں ہوئی۔ اس کا بیٹا عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز گو اپنے باپ سے بہادری میں بڑھ چڑھ کر تھا، مگر تدبر میں اسے اپنے اولوالعزم باپ سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ سعود کی وصیت تھی کہ مصریوں سے کھلے میدان میں ہرگز مقابلہ نہ کیا جائے مگر عبداللہ اپنی مردانگی اور شجاعت کے زعم میں یہ نصیحت نظر انداز کر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نجد کے بادیہ نشین جدید یورپی اسلحہ اور آلاتِ جنگ کی تاب نہ لا سکے۔ آخر ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء میں عبداللہ بن سعود نے سپر ڈال دی۔

محمد علی مصری نے اسے آستانہ بھیج دیا، جہاں وہ بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ ادھر محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا فاتح درعیہ نے نجدی پایۂ تخت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بوڑھوں اور بچوں تک کو نہیں چھوڑا گیا۔ مہینوں تک مصری فوج لوٹ مار کرتی رہی۔ مغربی فوجیں فتح پانے کے بعد جو کچھ کرتی ہوں گی، مصری فوج نے اس سے کچھ زیادہ ہی کیا۔ یہ تھی تیرہویں صدی ہجری کے آغاز میں مصری اور ترکی مسلمانوں کی حالت اور ان کا نظریۂ حکومت ———— اہلِ نجد کی تاریخی سرگذشت طویل اور دلچسپ بھی ہے۔ خاص کر ان کی نشأۃِ ثانیہ کی تاریخ حد درجہ حیرت انگیز ہے لیکن یہاں ہمارا مقصود نجد کی تاریخ بیان کرنا نہیں۔ اس موقع پر راقم نے صرف ان کی ابتدائی تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کر دیا ہے، تاکہ آئندہ اس مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہو، اور ہندوستان کے بدنام "وہابی" مجاہدین کے حالات پڑھتے وقت، نجد کے مظلوم اور موحد حنبلی "وہابیوں" کی تاریخ بھی پیشِ نظر رہے۔ تفصیل کے لئے۔ ملاحظہ ہو راقم کی کتاب (محمد بن عبدالوہاب "۔ ایک مظلوم اور بدنام مصلح) جس کا ذکر دیباچہ میں آ چکا ہے۔

دوسرا باب

بدنام وہابی

نجدیوں کا اٹھان ترکوں اور انگریزوں کی نگاہوں میں بری طرح کھٹکنے لگا۔ ترکوں کو اس لئے کہ ان کی "حرمین شریفین" کی "خادمیت" پر حرف آتا تھا، اور انگریزوں کو اس لئے کہ نجدی بحری طاقت نے خلیج فارس میں ان کے چھکے چھڑا دئے تھے۔ یہ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ درعیہ کی فتح ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء پر ابراہیم بن محمد علی مصری کو مبارک باد دینے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا خاص قاصد[1] بھیجا تھا۔ دوسری طرف محمد علی کی فوج میں متعدد فرانسیسی اور اطالوی افسر اور ڈاکٹر تھے۔ وسطِ عرب میں ترقی اور تجدد کی لہر ان سب کے گلوں کی پھانس بن گئی۔ اور وہ اُس کے خلاف اپنے مقبوضات میں پروپیگنڈا کرنے لگے۔ ترکوں نے مولویوں اور پیروں کی مدد حاصل کی۔ محمد عبدالوہابؒ کی طرف نسبت کریں، تو قاعدہ سے "محمدی" کہیں گے، جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، مگر "محمدی" کا لقب تو بدنام کرنے کے لئے کافی نہیں تھا۔ اس لئے شیخ الاسلام کے والد عبدالوہابؒ

---

[1] محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح

کی طرف نسبت کر کے "وہابیت" کا لقب ایک مذہبی گالی کے طور پر ایجاد کیا گیا۔
ترکوں اور انگریزوں کا یہ پروپیگنڈا خالص سیاسی حیثیت رکھتا تھا، مگر انہوں نے اسے مذہبی رنگ دینا شروع کیا۔ تاکہ مشائخ اور خوش عقیدہ مسلمانوں کو آسانی کے ساتھ مشتعل کیا جا سکے۔ مولویوں اور پیروں کی خدمت سے فائدہ اٹھایا گیا۔ مکہ معظمہ کے شیخ احمد زینی دحلان (ف ۱۳۰۴ھ) اور بدایوں کے مولوی فضلِ رسول (ف ۱۲۹۸ھ) اور ان کے پیروؤں کی کوششوں سے افتراپردازیوں اور بہتان طرازیوں کا ایک انبار لگ گیا، جس سے کم و بیش آج تک جاہل عوام متاثر ہیں۔ مگر اہلِ علم میں اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی ہے۔ ساحرانِ فرنگ کی عشوہ طرازیوں کا اتنا تجربہ ہو چکا ہے کہ اب یہ تاریخی حقیقتیں خود بخود نمایاں ہونے لگی ہیں اور پروپیگنڈوں کا تاریک نقاب تار تار ہو رہا ہے۔

ہندوستان کی اس پہلی اسلامی تحریک اور نجد کی دعوتِ توحید و اصلاح کا فرق

یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر تھا کہ ہندوستان میں حضرت سید احمد شہید بریلوی رح (۱۲۰۱ — ۱۲۴۶ھ) اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی رح (۱۱۹۶ — ۱۲۴۶ھ) کے ماننے والوں اور نقشِ قدم پر چلنے والوں کو بھی "وہابی" کے لقب سے یاد کیا گیا۔ حالانکہ انہیں نجد کے موحدین سے کوئی تعلق نہیں تھا یہ اور بات ہے کہ اصل سرچشمہ (کتاب و سنت) کی وحدت کے باعث دونوں تحریکوں کے درمیان بہت کچھ مماثلت پائی جاتی ہے "توحید" پر دونوں تحریکوں میں خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ شیخ الاسلام کی کتاب التوحید اور مولانا شہید کی تقویۃ الایمان بہت کچھ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ پھر بھی غور سے دونوں تحریکوں کا مطالعہ کیا جائے تو بعض اہم اور بنیادی مسئلوں میں بھی اختلافِ رائے کی جھلک صاف نظر آتی ہے

طریقِ کار کا فرق تو قدم قدم پر ظاہر ہوتا ہے[1]۔ لیکن پروپگنڈے اور سیاسی وسیہ کاریوں کا بُرا ہو، اسلامی ہند کی اس پہلی تحریکِ تجدید وجہاد کو بھی "وہابیت" کا نام دے کر بُری طرح بدنام کیا گیا[2] اور انگریز مصنفوں اور ان کی دیکھا دیکھی اپنوں نے بھی اس نام کو اتنی شہرت دی کہ آج حضرت سید احمد شہیدؒ کے پیرو اور ماننے والے اسی بدنام لقب (وہابیت) سے یاد کئے جاتے ہیں اور راقم کو خود اس تحریر کے آغاز میں (وہابیت) کی حقیقت بیان کرنا پڑی۔ لیکن کوئی غلط بات، صرف شہرت اور پروپگنڈے سے حقیقت نہیں بن سکتی۔ دجل اور فریب کا پردہ ایک نہ ایک دن چاک ہو کر رہتا ہے۔ آیئے ہم آپ کو داخلی اور خارجی شہادتوں کی روشنی میں دکھائیں کہ حضرت سید احمد شہید کی "دعوتِ تجدید وجہاد" نجد کی تحریکِ توحید و اصلاح سے بالکل متاثر نہیں ہوئی۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ (مولود ۱۲۰۱ھ) کو کم عمری ہی سے تجدید و احیائے سنت کی فکر دامن گیر تھی۔ اور ان کی دعوت میں ترکِ بدعات کی نسبت جہاد فی سبیل اللہ پر زیادہ زور تھا۔

اس کے برعکس شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کی دعوت میں توحید اور ترکِ بدعات کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ شیخ الاسلام کی کتاب التوحید میں "جہاد" پر کوئی خاص باب یا فصل نہیں۔ دوسری طرف سید شہیدؒ کا کوئی مکتوب 'جہاد' کے ذکر سے خالی نہیں ملتا۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی (شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۳۶-۱۲۹) اور راقم کی "مولانا سندھیؒ کے افکار و خیالات پر ایک نظر (صفحہ ۱۱۶-۱۰۲"

[2] اصل میں ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک پر "وہابیت" کا اطلاق صرف اس لئے کیا گیا کہ وہابیت کی اصطلاح پہلے گالی کے طور پر کافی مشتہر ہو چکی تھی۔ اب ایک نئی اصطلاح ایجاد کرنے اور چلانے کی زحمت کیوں اٹھائی جاتی۔

غالباً یہ دونوں ملکوں کے طبعی اور مقامی حالات کا نتیجہ تھا۔ نجد اور اس کے اردگرد مسلمانوں ہی جیسا نام رکھنے والے، بدعات اور شرک کی آلودگیوں میں مبتلا تھے۔ ہندوستان میں انہوں کی خرابی کے ساتھ ساتھ سات سمندر پار سے آئی ہوئی ایک قوم زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے رہی تھی۔ مزید براں ایک ہمسایہ لیکن نیم وحشی مذہبی گروہ پنجاب و سرحد کے غریب مسلمانوں کے لئے مستقل فتنہ بنا ہوا تھا۔ اس لئے سید شہیدؒ کے خلفاء اور مریدوں کا سارا جوشِ عمل جہاد و قتال ہی کی طرف مائل تھا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے اس راہ میں ہمیشہ سربکف رہے۔ اور آج بھی ان کا ایک گروہ حسنِ نیت کے ساتھ، خواہ غلط ہی سہی آیۂ ربانی

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (الاحزاب۔ ۲۳)

ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا۔ اس میں سچے اُترے۔ پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں۔ اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انہوں نے ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔

کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

سید شہیدؒ کا ظہور اس وقت ہوا، جب نجدیوں کی دعوت نجد اور اس کے اطراف میں محدود تھی اور حجاز پر قبضے سے پیشتر (۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء) دنیائے اسلام میں انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ محمد علی مصری نے (۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء) میں انہیں حرمین سے بے دخل کیا۔ اس طرح حرمین پر ان کا قبضہ نو سال سے زیادہ نہیں رہا۔ اور یہ زمانہ بھی یکسر جنگ و جدال میں بسر ہوا۔ حضرت سید شہیدؒ اور ان کے رفقاء ۱۲۳۷ھ میں حج بیت اللہ سے فارغ ہوئے، جب کہ مکہ مکرمہ میں نجدیوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بلکہ مکہ مکرمہ کے حکام حاجیوں کو اہلِ نجد سے ادنیٰ تعلق کے شبہ پر تنگ کیا کرتے تھے۔ پھر "نجدی وہابیوں" سے سید صاحبؒ

کے ملنے اور متاثر ہونے کا واقعہ افسانہ نہیں تو اور کیا ہے؟ نیز یہ بھی پیش نظر رہے کہ سید صاحب رح حج سے پیشتر ہی سکھوں سے جہاد کا عزم کر چکے تھے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سید شہیدؒ کی دینی تحریک، تجدید و احیائے دین کی ایک مستقل تحریک تھی، مشیتِ الٰہی یہ ہوئی کہ تجدیدِ اُمت کا سہرا ان کے سر رکھا جائے۔ توفیقِ باری سے انہیں رفیق اور جان نثار بھی ایسے میسر آئے، کہ صحابہ کرامؓ کے بعد اتنے نفوسِ قدسیہ کا ایک جا ہونا، تاریخ کے صفحات میں نظر نہیں آتا، نجد کی دعوتِ توحید سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ انگریز مصنفوں میں ولیم ولسن ہنٹر W. W. Hunter نے حضرت سید شہیدؒ اور ان کی جماعت پر ناروا اور رکیک حملے کئے ہیں۔ اور ان کے پیرؤوں کی "باغیانہ" سرگرمیوں پر اس نے بہت تفصیل سے خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ اسی کے دماغ کی اُپج ہے کہ سید شہیدؒ نجد کے وہابیوں سے متاثر تھے، اور اسی کی تقلید میں اپنوں اور غیروں نے بھی اس غلط بیانی کا بار بار اعادہ کیا ہے۔ اس مختصر سی تحریر میں ہنٹر کی غلط بیانیوں پر تفصیل سے گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ یہاں ہمیں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ مجاہدین کا یہ سفید فام دشمن اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود اس سلسلے میں جو لکھ سکا ہے۔ اس سے بھی سید صاحب رح کا نجدیوں سے ملنا ثابت نہیں ہوتا۔ ہنٹر صاحب فرماتے ہیں۔

لہ ہمیں اہلِ نجد اور ان کی دعوتِ توحید و اصلاحِ اُمت سے کوئی اختلاف یا بیر نہیں۔ ہمارا عمل کتاب و سنت پر ہے، ہم نہ سید شہیدؒ کے مقلد ہیں نہ محمد بن عبدالوہاب رح نجدی کے۔ یہاں صرف غیروں اور اپنوں کی اس پھیلائی ہوئی غلط بیانی کا ازالہ مقصود ہے "کہ سید صاحب کی دعوتِ تجدید و جہاد نجدی تحریکِ توحید سے متاثر تھی"۔ یہ بحث خالص علمی اور تحقیقی ہے۔ حربِ عقاید یا سیاسی پروپگنڈا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

"قیامِ مکّہ کے زمانے میں حکّام کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی۔ اس لیئے کہ ان کی دعوت ان بدوؤں (محمدؒ بن عبدالوہابؒ کے ماننے والوں) سے ملتی جلتی تھی جنہوں نے گزشتہ سالوں میں مقاماتِ مقدسہ کو بہت گزند پہنچایا تھا۔ مجاہدوں نے ان کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کیا اور حرم سے نکال دیا۔"[1]

گویہ "حقارت کا برتاؤ" اور "حرم سے نکالنے کا واقعہ" یکسر ہنٹر کے دماغ کی پیدا وار ہے، پھر بھی ہم یہاں اسے نظرانداز کرتے ہوئے اہلِ نظر وارباب انصاف سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ سیّد شہید (ش ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) شیخ الاسلام محمدؒ بن عبدالوہابؒ (ف ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء) کی تعلیمات سے متاثر ہوئے تھے؟ ورنہ ہمارے پاس اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ مکّہ مکرمہ کے حکّام وامراء نے سیّد شہیدؒ کی پوری خاطر مدارات کی اور انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔

خود ہنٹر اسی کتاب میں دوسری جگہ[2] لکھتا ہے:۔

"کسی وہابی کے لیئے ممکن نہ تھا کہ جان جوکھوں میں ڈالے بغیر مکّہ (مکرمہ) کی سڑکوں پر چل سکے۔ یہ حال ۱۸۱۳ء سے ۱۸۳۰ء تک رہا۔"

اور ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ حضرت سیّد صاحبؒ اور ان کے رفقاء ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۲ء میں حج بیت اللہ سے شرف یاب ہوئے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ بدنام وہابی مبلّغوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور وہ ان کی تعلیم سے متاثر ہوئے؟ اصل یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے عام انحطاط اور پستی کے عالم میں نجدی بدوؤں کا اٹھان اور ان کی "شمشیر زنی" "یورپی سیاست کا روں اور اسلامی خدمت" کے ترکی اجارہ داروں کو ایک آنکھ نہیں بھائی اور انہوں نے "نجدیوں"

---

[1] The Indian Musalmans. طبع جدید صفحہ ۵۲

[2] The Indian Musalmans. ایضاً: صفحہ ۱۰۰

کو "وہابی" کا نام دے کر بدنام کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ دنیائے اسلام کی ہر مفید تحریک پر وہابیت کا لیبل لگانا معاندینِ اسلام کا عام شعار ہو گیا۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مضمون "وہابیت" کا لکھنے والا مشہور دشمنِ اسلام اور شاتمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مارگولیوتھ عجیب و غریب حماقتوں کا مرتکب ہوا ہے مولانا شہیدؒ کو سید صاحبؒ کا بھانجا یا بھتیجا اور صراطِ مستقیم کو وہابیہ ہند کا قرآن کہتا ہے۔(Wahabiyah)اس کا مقابلہ "وہابیت" (مندرجہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) تاریخی و تصنیفی اغلاط کا مضحکہ انگیز مرقع ہے۔ لیکن اسی انسائیکلوپیڈیا میں ابن سعود اور (سید) احمد کے مقالے اچھے اور عالمانہ ہیں۔ ہمیں یہاں سید احمد والے مقالے سے ہے۔ اس کا لکھنے والا[1]۔ ایک حد تک سید شہیدؒ اور محمدؒ بن عبدالوھاب کی تحریکوں کو سمجھا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا فرق اس کی نگاہ میں ہے، لکھتا ہے:۔

"کچھ دنوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ (سید صاحب) وعظ و ارشاد کے لئے دورہ کرنے لگے۔ اِن کے خیالات ایک حد تک عرب وہابیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ سادہ عبادت، بدعات سے اجتناب، خرافات پر عقیدت سے بُعد اور انبیاء کی تعظیم میں حد سے زیادہ غلو سے پرہیز ——— ان امور میں ان کے اور نجدی وہابیوں کے درمیان مماثلت ہے:۔

۱۲۳۶ھ میں سید احمد شہید حج کے لئے مکہ روانہ ہوئے اور جب دو سال کے بعد ہندوستان واپس ہوئے تو پنجاب کے مسلمانوں کو جور و ظلم سے نجات دلانے کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔

اس میں شک نہیں کہ دونوں تحریکوں کے درمیان ایک حد تک مشارکت اور مماثلت

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: مقالہ (Blumhart)

پائی جاتی ہے اور اصل سرچشمہ میں اتحاد کے باعث ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ کتاب و سنّت سے براہِ راست اکتساب فیض کرنے والی جماعتیں جہاں بھی کام کریں گی، ان کا طریقِ کار اور دعوت کی بنیادی فکر ملتی جلتی ہوگی۔ لیکن اس "مماثلت و مشارکت" کی بنیاد پر جھوٹی تاریخ نہیں بنائی جاسکتی اور یہ واقعہ اپنی جگہ ثابت اور متحقق ہے کہ سید صاحب رح نجدی کی تحریکِ توحید سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔ اور نہ ہی نجدی عالم اور داعی سے ان کا ملنا ثابت ہے۔

وہابی اور اہلِ حدیث

اسی سلسلے میں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ مناسب ہوگا۔ ہندوستان میں حضرت سید صاحب رح کی دعوتِ تجدید و جہاد کے ساتھ ساتھ اتباعِ سنّت اور عمل بالحدیث کا چرچا بھی شروع ہوا۔ خود سید صاحب رح اور اُن کے خاص ماننے والے یعنی اہلِ صادق پور تو اپنے کو "حنفی مع القول بالترجیح" کہتے تھے۔ مگر خود سید احمد صاحب رح کی جماعت میں مولانا اسماعیل شہید رح (ش ۱۲۴۶ھ) کے اثر سے خالص "عاملین بالحدیث" کا بھی ایک طبقہ پیدا ہوگیا تھا۔ شروع شروع میں یہ دونوں طبقے یعنی حنفی اور اہلِ حدیث ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ دونوں کا زور جہاد پر تھا اور ان فروعی مسئلوں میں وہ روادار تھے۔ مگر آگے چل کر جب مجاہدین کی داروگیر شروع ہوئی اور سرِ آمین بالجہر کہنے والے پر "وھابی" کا شبہ کیا گیا۔ اور "وھابی" کے معنی سرکاری زبان میں "باغی" کے ہوگئے (جیسا کہ آئندہ صفحات میں آتا ہے) تو ہندوستان کی جماعت اہلِ حدیث موجودہ شکل میں نمایاں ہوئی اور ان کے سرگروہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی (۱۲۵۶ھ — ۱۳۳۸ھ) نے سرکارِ انگریزی کی اطاعت کو واجب[1]

---

[1] مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے جہاد کی منسوخی پر ایک رسالہ (الاقتصاد فی مسائل الجہاد) فارسی زبان میں تصنیف فرمایا تھا اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی شائع کرائے تھے۔ معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے معاوضے میں سرکارِ انگریزی سے انہیں "جاگیر" بھی ملی تھی ——— اس رسالہ کا پہلا حصہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ پوری کتاب تحریف و تدلیس کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ نمونہ کے لئے مندرجہ ذیل اقتباس کافی ہوگا۔

٭ (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

قرار دیا۔ اور حد یہ کہ وقت کے بعض مشہور حنفی علماء[1] کو سرکار سے بغاوت کے طعنے دئیے[2] ۔ ان بیچاروں کو یہ ہوش نہیں رہا کہ وہ اپنے کو سرکار کی زد سے بچانے کی فکر میں کیا کر رہے ہیں اور اپنے ماننے والوں کو کس پستی کی طرف لے جا رہے ہیں؟ مولوی محمد حسین صاحب اور ان ہی جیسے بعض علماء اہلِ حدیث کی روش کا یہ نتیجہ ہوا کہ موجودہ جماعت اہلِ حدیث کا عام رجحان فروعی مسئلوں تک، محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ پوری جماعت اہلِ حدیث، ایسی ہی ہے حَاشَا وَکَلَّا! ان ہی میں اہلِ صادق پور بھی ہیں، جو سید صاحب رح کے عشق و محبت میں خود اُن کے اہلِ خاندان سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں، نیز ہندوستان کے طول و عرض میں سینکڑوں اہلِ حدیث ایسے ملیں گے جن کے دل اب بھی جذبۂ جہاد سے معمور ہیں۔ اور وہ اپنے اسلاف کی روش پر سختی کے ساتھ قائم ہیں۔ اِس کے علاوہ سید صاحب رح کے ماننے والے اور ان کے مسلک کے مطابق جہاد و اصلاح کا ولولہ رکھنے والے اہلِ حدیث طبقہ کے اندر محدود نہیں۔ اہلِ دیوبند (جو پکے حنفی ہیں) کا ایک اچھا خاصا طبقہ سید شہید رح کے مسلک پر چلنا اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھتا ہے۔ اہلِ دیوبند اور جماعت اہلِ حدیث کے علاوہ بھی سمجھدار مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد سید صاحب رح اور مولانا شہید رح کے مشرب و مسلک کو عین اسلام تصوّر کرتی ہے۔ یہ تمام طبقے عرفِ عام کے مطابق "وھابی" کی فہرست میں آتے ہیں۔ مگر انہیں اہلِ حدیث نہیں کہا جا سکتا۔ اہلِ حدیث، ایک بالکل دوسری جماعت ہے، جو باطنیوں اور شیعوں کے توڑ کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ کوئی نئی جماعت نہیں بنو عباس

---

* **نتیجہ مسئلہ اولیٰ:** ازیں مسئلہ ثابت و متحقق شد کہ کمالِ اسلام و ایمان و نجاتِ اہلِ اسلام بر جہاد موقوف و منحصر نیست۔ اگر مسلمانان نا راز فرائض دینی باز مدارند مجرد عبادت برائے نجات و کمالِ ایمان کافی است۔ پس آنانکہ الخ۔ (ص۳)

[1] مولانا فضل حق خیرآبادی (اسیر انڈمان: ف ۱۲۷۸ھ) اور حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکہ (ف ۱۳۱۷ھ) وغیرھم۔ [2] رسالہ اشاعت السنۃ۔

کے اوائلِ عہد (دوسری صدی ہجری) ہی میں محدّثین اور اہلِ حدیث کا گروہ ممتاز و مشہور تھا۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ جماعت اہلِ حدیث آمین و رفع یدین اور اس قسم کے دو چار فرعی مسئلوں پر قانع ہو کر رہ گئی ہے، بلکہ اب اس کی حیثیت "جماعت" سے زیادہ "فرقہ" کی ہو گئی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہندوستان کے اصطلاحی "وھابی" اور ہیں اور "اہلِ حدیث" اور۔ اور راقم[1] ان دونوں لفظوں کے استعمال میں اس فرق کو ملحوظ رکھتا ہے گو سچ پوچھئے تو لفظ "وہابی" کا اطلاق کسی گروہ پر صحیح نہیں۔

---

[1] راقم کو اگر کوئی طنز سے 'وہابی' کہتا ہے، تو تردید کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لیکن اگر کوئی 'اہلِ حدیث' کے نام سے یاد کرے، تو اس سے برأت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ 'اہلِ حدیث' سے تحزّب اور گروہ بندی کی بُو آتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے موجودہ دَور میں حنفیت اور شافعیت وغیرہ فقہی مذہب ہونے کی جگہ مستقل "دین" بن کر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف تحزّب اور فرقہ بندی کا زور ہے، ضرورت اصول پر زور دینے اور فرقہ بندی روا نہ رکھنے کی ہے۔

سید احمد شہیدؒ ۱۲۰۱ھ تا ۱۲۴۶ھ

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک کے داعیٔ اوّل اور قائد، حضرت سید احمد شہید بریلوی کی ولادت ماہِ صفر ۱۲۰۱ھ[1] میں ہوئی۔

تکیہ[2]، رائے بریلی (اودھ) میں حسنی سادات کا مشہور خاندان آباد ہے۔ سادات کا یہ

---

[1] مضمون کے تسلسل کے لئے ہم نے سید صاحبؒ کے مختصر حالات درج کر دئیے ہیں تفصیل کیلئے سوانح احمدی (محمد جعفر تھانیسری) اور سیرتِ سید احمد شہید (ابوالحسن علی ندوی) کا مطالعہ کیا جائے۔ بعض اصحابِ علم نے اعتراض کیا ہے کہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، میں خود اس کے قائد کے حالات میں اختصار سے کیوں کام لیا گیا؟ غرض یہ ہے کہ ہم نے تحریک کے صرف اس حصّے کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے، جس کے حالات نگاہوں سے اوجھل تھے اور جن کے اظہار سے جاننے والے بھی اب تک ڈرتے رہتے تھے۔

[2] عام طور پر مشہور یہ ہے کہ سید شہید کی ولادت پہلی محرم الحرام ۱۲۰۱ھ کو ہوئی۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری اور ان کی نقل میں دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے، حالانکہ سید شہیدؒ کے متعلق سب سے زیادہ مستند کتاب مخزنِ احمدی (جو ان کے بھانجے مولوی سید محمد علی صاحب کی تصنیف ہے) میں ولادت ماہِ صفر میں درج ہے:۔

"ولادت باسعادت حضرت سید المجاہدین۔ در شہرِ صفر بعد گذشتن یک ہزار و دو صد سال واقع گردید"

(ورق نمبر ۱ ب : مخطوطہ)

"تکیہ" (جو دائرہ شاہ علم اللہؒ کے نام سے بھی مشہور ہے) رائے بریلی شہر سے میل ڈیڑھ میل دور ایک نہایت ہی پُر فضا ٹیلے پر واقع ہے۔ سید صاحبؒ اسی حسنی خاندان کے گوہر شب چراغ تھے آپ نے رسمی تعلیم کم پائی۔ مشیّت کو کچھ اور کام لینا تھا، معلموں نے لاکھ جتن کئے، پر آپ کی طبیعت مدرسوں کی فرسودہ تعلیم کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ اُمّی تھے۔ بعض عقیدتمندوں نے خواہ مخواہ انہیں اُمّی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب آپ کی عمر سترہ سال کی ہوئی اور شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، تو روزگار کی تلاش میں گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ لکھنؤ میں ایک مسلمان نواب کے ہاں کچھ دنوں قیام رہا۔ پھر دہلی تشریف لے گئے، اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ دہلوی (ف ۱۲۳۰ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ دہلوی (ف ۱۲۳۹ھ) کے دستِ مبارک پر بیعت کی ــــــ یہ ۱۲۲۲ھ کا ذکر ہے، جب آپ کی عمر ۲۲ سال سے زیادہ نہ تھی۔ دہلی کے اس پہلے سفر کے بعد آپ وطن لوٹ آئے اور تقریباً دو برس وہیں رہے۔ اسی مدّت میں آپ نے نکاح کیا۔

اس کے بعد پھر آپ نے راجپوتانہ کا سفر اختیار کیا۔ جہاں نوّاب امیر خاں کا قیام تھا۔ راستہ میں دہلی ٹھہرتے ہوئے نوّاب امیر خاں کے پاس پہنچے (تقریباً ۱۲۲۴ھ) سید صاحبؒ کے دل میں جہاد کا شوق تو بدو شعور سے موجود تھا ہی، نواب کی فوج میں اس شوق کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا۔ اور اس غرض سے ایک مدّت تک (سوانح احمدی، میں یہ مدّت سات برس بیان کی گئی ہے) وہاں جہاد کی ترغیب دیتے رہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ نواب امیر خاں کی فوج میں آپ کا قیام صرف واعظ و مبلّغ ہی کی حیثیت سے تھا۔ بلکہ وہ متعدّد لڑائیوں میں ایک دستے کے امیر اور نواب کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے شریک رہے۔

لیکن جب وہاں کی فضا سازگار نہ رہی، تو مجبوری میں آپ نے پھر دہلی کا رُخ کیا۔ (۱۲۳۱ھ) اصل میں سید صاحبؒ کو توقع تھی کہ نواب کی اعانت سے ہندوستان کے اندر حقیقی جہاد کا موقع پیدا ہو سکے گا۔ مگر جب نواب نے انگریزوں سے صلح کر لی، تو یہ توقع

ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی اور دہلی لوٹ کر آپ کو اس غرض کے لئے علیحدہ اور مستقل جد وجہد کرنا پڑی۔

دہلی قدم رکھتے ہی کامیابی نے قدم لئے۔ خاندانِ ولی اللّٰہی بھی عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا۔

خود حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (ف ۱۲۳۹ھ) کے داماد مولانا عبدالحیؒ (ف ۱۲۴۳ھ) اور ان کے بھتیجے مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) اور خاندان کے دوسرے سرکردہ حضرات، آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ارشاد و ہدایات کا سلسلہ پھیلنے لگا۔ مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شہیدؒ کی معیت میں آپ نے ملک کے اطراف واکناف کے دورے کئے۔ جہاں گئے، ان کے دم قدم سے توحید کی تعلیم پھیلی اور شرک وبدعت کی اندھیاری کافور ہوئی۔ سوانح پڑھئے تو آپ کی تاثیر و جاذبیت کا کچھ عجیب حال نظر آتا ہے۔ اثر پذیری اور جاذبیت کے ایسے دل فریب مرقعے عہدِ صحابہؓ کے بعد پھر دیکھنے میں نہیں آئے۔ بے جا عقیدت اور شخصیت پرستی کے جذبے سے بالکل الگ ہو کر عرض کیا جاتا ہے کہ سید صاحبؒ اور ان کے رفیقوں کے قدم جس زمین پر پڑ گئے، وہ سونا اُگلنے لگی، اور ان کی نگاہیں جن دلوں میں اتر گئیں وہ حقائق و معارف کا گنجینہ بن گئے۔ ایک مثال ہو تو پیش کی جائے۔ بہرحال نہ جاننے والوں کے لئے عرض ہے۔ بہار کے رئیس زادے اور ناظمِ بہار کے نواسے ولایت علی عظیم آبادی صادق پوری نے لکھنؤ میں شرفِ نیاز حاصل کیا۔ اور نقدِ دل وہیں ہار بیٹھے اور پھر ایسے حلقہ بگوش ہوئے کہ اپنی ذات تو خیر ایک چیز ہے، اپنے پورے خاندان کو قدموں پر لا ڈال دیا۔ اس کے بعد سید صاحبؒ کی تشریف آوری سے پٹنہ مشرف ہوا، تو خاندان کے تمام افراد نے بیعت کی۔ اور دامنِ ارادت سے وابستہ ہو گئے۔ اس وابستگی کا نتیجہ دیکھنا ہو، تو گورنمنٹ آف انڈیا کے ریکارڈ اُٹھا کر دیکھو، مقدمات سازش کی رُودادیں پڑھو، سرحد اور ماورائے سرحد کی پہاڑیوں اور دشوار گزار گھاٹیوں سے پوچھو سید صاحبؒ کی شہادت (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) سے لے کر پورے سو برس تک مسلسل (۱۸۳۱ء — ۱۹۳۴ء) جس

طرح اس خاندان نے جہاد کا علَم سربلند رکھا، وہ قربانی اور سرفروشی کی تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پڑی۔ عرض یہ کرنا تھا کہ سیّد صاحبؒ اور ان کے رفیقوں نے ۱۲۳۳ھ اور ۱۲۳۴ھ کے درمیان میرٹھ۔ مظفر نگر۔ سہارن پور اور شمالی ہند کے بعض دوسرے اضلاع کا دورہ کیا۔ لوگوں کو توحید اور اصلاحِ بدعات کی تلقین کی۔ لاکھوں نے بیعت کی اور ہزاروں آپ کی تبلیغ سے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ ان ہی دنوں پنجاب میں سکھوں کے ظلم و ستم کی روداد یں سننے میں آئیں توسمندِ شوق کو ایک اور تازیانہ لگا اور عزمِ جہاد[1] کو بروئے کار لانے کا زمانہ قریب معلوم ہونے لگا مگر پہلے سفرِ حج[2] کو ترجیح دی۔ اثنائے سفر میں ہزاروں نے ہدایت پائی۔ گفتگو اور صحبت میں بلا کی تاثیر تھی۔ سیّد صاحبؒ کا سفرِ حج، بے شمار برکتوں

---

[1] راقم پہلے عرض کر چکا ہے کہ سیّد صاحبؒ کو بدوِ شعور ہی سے جہاد کا شوق تھا، اور یہ عزمِ جہاد مسلسل قائم رہا یہ محض اتفاق تھا کہ جس مقام کو انھوں نے اپنا مستقر بنانے کا فیصلہ کیا، وہاں سکھوں سے پہلا مقابلہ پیش آیا۔ ورنہ سیّد صاحبؒ انگریزوں کو بہرحال سکھوں سے زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔ مکاتیب اور دوسرے مستند وثائق سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ سکھا شاہی کے ظلم و ستم کی داستان صحیح نہیں۔ سکھوں کے مظالم اپنی جگہ پر ہیں، اور مجاہدین کو پہلے انہیں کا تدارک کرنا پڑا۔ مقصود صرف اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ہے۔ جو بعض "نیک نیّت" لوگوں نے حالات کی تبدیلی سے مجبور ہو کر پیدا کر دی تھی کہ سیّد صاحبؒ انگریزوں سے جہاد کا مطلق ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

[2] آپ کا سفرِ حج بھی مستقل جہاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عام بدامنی اور سفر کی مشکلات کے باعث بعض علماء نے سقوطِ حج کا فتویٰ! دے دیا تھا۔ آپ کے رفیقوں مولانا عبدالحیؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ نے اس فتوے کی علمی تردید بھی کی تھی۔

کا باعث ہوا۔ تقریباً تین برس مسلسل سفر میں رہے۔ پہلی شوال ۱۲۳۶ھ عین عید کے روز (۲؍جون ۱۸۲۱ء) نماز کے بعد رائے بریلی سے رخصتِ سفر باندھ کر روانہ ہوئے۔ چار سو مرد، عورتیں اور بچے اس قافلہ میں تھے۔ ہر منزل پر قیام اور تبلیغ کرتا ہوا مبلّغین اور مجاہدین کا یہ قافلہ عید الاضحیٰ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء میں حجِ بیت اللہ سے مشرف ہوا۔ پھر مدینہ منورہ کی زیارت کی۔ اور دو تین مہینوں کے بعد مکۂ مکرمہ واپس ہوا۔ اور وہاں سات آٹھ مہینے قیام کرکے ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء میں بادلِ محزون و دیدۂ پُرنم علماء و صلحاء کا یہ گروہ وطنِ مالوف کی طرف چل کھڑا ہوا۔ ۲۹؍شعبان ۱۲۳۹ھ (۳۰؍اپریل ۱۸۲۴ء کو (یعنی تقریباً تین برس کی غیر حاضری کے بعد) یہ قافلہ پھر اپنی منزل پر واپس آگیا۔ مجاہدین کے کرم فرما ولیم ولسن ہنٹر فرماتے ہیں کہ "سید صاحبؒ کو مکہ معظمہ سے نکالا گیا" اور ان کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا گیا۔ ہم اس کے برعکس دیکھتے ہیں کہ وہ حج کے بعد بھی سات آٹھ مہینے حرم میں اقامت فرما ہیں، اور بلادِ حرم کے ممتاز علماء آپ کے فیضِ صحبت سے مشرف ہو رہے ہیں۔ غلط بیانی کی حد ہوتی ہے۔

جہاد

حج کے بعد پھر وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مگر اب کے اصلی زور جہاد و ہجرت پر تھا۔ مولانا شہیدؒ اور مولانا عبد الحیؒ اور دوسرے ممتاز حضرات مختلف اطراف میں تبلیغ و ارشاد کے لئے بھیجے گئے۔ ساتھ ساتھ جہاد کی عملی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس وقت پنجاب میں سکھا شاہی، کا زور تھا۔ مسلمانوں کی مسجدیں اور عبادت گاہیں ان کے تصرف میں تھیں۔ غریبوں کی آبرو بھی محفوظ نہیں رہی تھی۔ غرض مظالم کا ایک بے پناہ سیلاب تھا جو پانچ دریاؤں کی مسلم آبادی کو بہائے لئے جا رہا تھا۔ آنکھیں سب کچھ دیکھتی تھیں مگر قوائے عمل مفلوج ہو چکے تھے۔ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) کا آغاز مسلمانانِ ہند

کے لئے مصیبت و ابتلا کی گھڑی تھی۔ یوں بھی یہاں کبھی اسلامی حکومت نہیں قائم ہوئی مگر اب تو نام کی مسلمان حکومت کا بھی جنازہ نکل رہا تھا یا نکل چکا تھا۔ جس ملک میں بادشاہ اور کشور کشا کی حیثیت سے صدیوں گلچھرے اُڑاتے رہے۔ اب اس کا چپہ چپہ ان کے خون کا پیاسا تھا اور طرّہ تو یہ کہ جس راہ سے وہ ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اور جہاں باہر سے آنے والی قومیں زیادہ تعداد میں آباد تھیں، خود وہاں کی زمین ان پر تنگ ہونے لگی۔ حالانکہ قرب و جوار میں مسلمان نام رکھنے والی چھوٹی بڑی ریاستیں اب بھی موجود تھیں۔ سرحد میں خوانین کے مختلف گھرانے اپنی نسلی شرافت اور روائتی شجاعت پر بدستور نازاں تھے۔ لیکن کشورِ ہند کے طول و عرض میں اگر اللہ کا نام لے کر کوئی اُٹھا، تو وہ چند سر پھرے "مولوی" اور "مُلانے" تھے۔ مسند درس پر، قال اللہؐ اور قال الرّسولُ کا کلمہ رٹنے والوں نے میدانِ کارزار میں مسندِ جہاد بچھانے کی ٹھانی۔ یہ اللہ کے بے برگ و نوا بندے صرف اسی کی رحمت و توفیق کے بھروسے پر، سیّد احمد بریلویؒ کی قیادت میں گھر بار چھوڑ کر چل کھڑے ہوئے۔ خوب معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ قرآن و حدیث کا درس دینے والوں نے شمشیر زنی اور توپ افگنی کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ کامیابی و کامرانی ان کے ہمرکاب تھی۔ ظفرمندی قدم لینے کو آگے بڑھی، پشاور کی سرزمین نے اطاعت میں سبقت کی۔ قریب تھا کہ سارا پنجاب و سرحد اسلامی نور سے جگمگانے لگتا اور ایک مرتبہ پھر خلافتِ راشدہ کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے آجاتا، مگر ابھی مسلمانوں کے بُرے دن لکھے تھے۔ بُرا ہو نسلی غرور اور قبائلی عصبیت کا، جس نے اس تمام کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ کچھ مجاہدین کی ناتجربہ کاری[1]، کچھ علماءِ سوء کی تفریق انگیز حرکات، اور سب پر مستزاد افغان

---

[1] ایک صاحبِ علم دوست اس موقع پر "ناتجربہ کاری" کا استعمال نہیں سمجھتے۔ راقم نے پھر غور کیا، لیکن اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس "ناکامی" میں "ناتجربہ کاری" کا بھی دخل ضروری تھا۔ مثال کے طور پر یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ افغانی قبائل میں مسلسل دعوت و تبلیغ کے بعد زمین تیار کرنے سے پہلے شرعی حدود کو

بقیہ حاشیہ صــ۳۶ پر

سرداروں کی جاہلانہ عصبیت، ان سب چیزوں نے مل ملا کر کایا پلٹ دی۔ حنفیت و وہابیت کے جھگڑے الگ کھڑے ہو گئے۔ علماء سوء اور قبر پرستوں نے مجاہدینِ امت پر کفر کے فتوے لگائے سرحد کے خوانین نے اپنے مرشد اور محسن سے غداری کی ------- نتیجہ یہ ہوا کہ سید شہیدؒ نے بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ مولانا اسماعیل شہیدؒ بھی دلی مراد پا گئے۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن　　خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ یوم جمعہ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) مشہد بالاکوٹ[1] کا ذکر ہے۔

خامہ بیے نوا ! ادب سے سر جھکا اور عرض کر "بالاکوٹ کی سرزمین !! تجھ پر اللہ کی ہزار ہزار رحمت کہ تیری خاک میں امت کی بہترین آرزوئیں آسودۂ خواب ہیں۔"

ایک طرف ان نفوسِ قدسیہ کی یہ قربانیاں اور فداکاریاں ہیں اور دوسری طرف ہندوستان کے بے شرم مسلمانوں کی طرف سے "تکفیر و تفسیق" کا صد سالہ لٹریچر، جو بدایوں سے لے کر مدارس تک پھیلایا گیا اور اب تک پھیلایا جا رہا ہے (گو اب تکفیر کی تلوار کُند ہو چلی ہے) خانقاہوں میں بیٹھ کر، جوگیوں کی طرح مالا جپنے والے، سید احمدؒ اور اسماعیل شہیدؒ جیسے مجاہدینِ امت پر کفر کے فتوے لگائیں۔ مسلمانانِ ہند پر اس سے زیادہ اور کوئی منحوس گھڑی نہیں آئی۔ اور بدنصیبی یہ ہے کہ بدبختوں[2] نے آج تک اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کو معاف نہیں

حاشیہ صفحہ ۳۵: جاری کر دینا کوئی صحیح طریقِ کار نہیں تھا۔ اس طرح کی اور مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں۔ داعی کو جوش و ولولہ کے ساتھ صبر و تحمل سے بھی آراستہ ہونا چاہیئے۔

[1] بالاکوٹ ضلع ہزارہ کے کوہستانی علاقے میں وادیٔ کاغان کے جنوبی دہانے پر واقع ہے۔

[2] بعض دوستوں نے راقم کے لہجہ اور تلخیٔ بیان کی شکایت کی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کو "بدبخت" کے سوا اور کیا کہا جائے، جو ان بزرگوں کو گالیاں دے دے کر پورے سو برس سے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کر رہے ہیں۔ "رنگ کے تودے" "کوہ و دماوند" کہنا راقم کے بس کی بات نہیں اور اگر یہ جرم ہے تو عاجز کو اسکا اعتراف ہے۔

کیا، مشہدِ بالاکوٹ کو آج سو برس سے اوپر ہو چکے ہیں، مگر ان پاک ارواح "پر طعن و تشنیع" کا سلسلہ جاری ہے۔

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

بالاکوٹ کی تربت میں آرام کرنے والو! تم پر اللہ کی رحمت اور سلام! تمہاری ہڈیاں پھولوں میں رہیں اور اللہ تمہیں شہداء اور صالحین کی صف میں جگہ دے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُمْ وَاحْشُرْهُمْ فِي زُمْرَةِ الْمُهَاجِرِيْنَ الْاَوَّلِيْنَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا مَعَ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

ہم گنہگاران کی مغفرت کے لئے کیا دعا کریں؟ شاید ان کے اعمالِ حسنہ کی یاد میں کچھ ہمارے گناہ بھی معاف ہو جائیں۔

دعوت اور مشن

سید صاحبؒ کی دعوت خالص کتاب و سنت کی دعوت تھی۔ بدعت و شرک کا مٹانا ان کا مشن تھا۔ وہ دینِ محمدی میں عہدِ فاروقی کی پاکیزگی اور شوکت پیدا کرنا چاہتے تھے توحیدِ خالص کی تبلیغ، قبر پرستی کا استیصال، مراسمِ تعزیہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا، اور نکاحِ بیوگان کی ترویج ان کی دعوت کے اہم اجزا تھے۔ ان کی دعوت کامیاب ہوئی یا ناکام اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ زمانہ شاہد ہے، اور گزشتہ صدی کی تاریخ گواہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس وقت تک اسلامی ہند میں جو کچھ اصلاح و تجدید ہو سکی ہے، سب کی سب سید شہیدؒ اور ان کے کفش برداروں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کم سے کم پورب کے علاقوں میں روشنی کی جھلک سراسر اسی آفتابِ عمل کا فیض ہے۔ صادق پور (عظیم آباد) کا مشہور خاندان سید شہیدؒ اور ان کے ایک مرید مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) کی بدولت دنیائے عمل میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔ اور ایک "پورب" پر کیا منحصر ہے،

دلی، رام پور، جون پور، روہیلکھنڈ، مدراس ـــــــ اس آفتابِ تجدید کی شعاعیں کہاں نہیں پہنچیں؟ سید صاحبؒ اور ان کے خدام نے ملک کے طول و عرض میں جس طرح اصلاح رسوم و محو بدعات کا فریضہ ادا کیا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ سینکڑوں واقعات اب تک قلم بند نہیں ہو سکے ہیں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ والد ماجد مولانا حکیم محمد عبد الشکور صاحب مدظلہ (مولود سنہ ۱۲۹۰ھ) نے گزشتہ شوّال (سنہ ۱۳۶۳ھ) کے موقع پر زمانیہ[1] (غازی پور) کے ایک غازی صاحبؒ کا بیان فرمایا تھا، اور اب خادم کی درخواست پر گرامی نامہ مورخہ ۱۹ محرم الحرام سنہ ۱۳۶۴ھ میں اس کی تفصیل بھی کر دی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا، اگر گرامی نامہ پورا کا پورا یہاں نقل کر دیا جائے:۔

زمانیہ کے غازی صاحبؒ کے متعلق اتنا یاد ہے کہ اندازاً سنہ ۱۳۰۱ھ یا سنہ ۱۳۰۲ھ، جس زمانے میں میری عمر بارہ سال کی ہوگی۔ ایک شخص غازی پور، زمانیہ کے رہنے والے قد و قامت میں لمبے چوڑے، ضعیف العمر[2]، مگر طاقت و قوت و دلیری میں جوانوں کو مات کرتے تھے تہجد گذار، متبعِ سنت، مولوی کفر توڑ کے نام سے مشہور تھے۔

ایک موٹا عصا، جس میں لوہے کا پھل لگا ہوا تھا، ساتھ رکھتے تھے اور کہتے کہ یہ کفر توڑ ہے۔ جہاں کہیں جاتے، ان کا کام یہ تھا کہ جہاں امام باڑہ کا چبوترہ دیکھتے، اسی کفر توڑ سے اکھاڑتے۔ جب وہ بنارس میں میری موجودگی میں پہنچے۔ تو مولوی محمد سعید صاحب[3] مرحوم کے یہاں قیام کیا۔ محلہ دارانگر کی مسجد میں (جس میں مولوی صاحب مع اپنے طلباء و متبعین

---

[1] مشرقی یو۔ پی کے ضلع غازی پور کا ایک مشہور قصبہ۔

[2] حساب سے کم سے کم ان کی عمر (۷۰ اور ۸۰) کے درمیان ہوتی ہے۔

[3] مولانا محمد سعید صاحب کنجاہی بنارسی ف ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء۔ تراجم علمائے حدیث ہند صفحہ نمبر ۳۵۶-۳۵۳

سے نماز پنجگانہ ادا کرتے تھے) صحنِ مسجد کے وسط میں ایک چبوترہ مربع تھا۔ جس پر تعزیہ رکھا جاتا تھا۔ تین چار روز تک بڑا ہنگامہ رہتا تھا۔ جب مولوی کفر نوڑ صاحب پہنچے، تو انہوں نے اس چبوترے کو اکھیڑ کر پھینک دیا۔ چونکہ اس محلے میں مولوی صاحب مرحوم کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لئے کچھ فساد نہیں ہوا۔ مولوی کفر نوڑ صاحب مرحوم سید صاحبؒ علیہ الرحمۃ اور مولانا شہید علیہ الرحمۃ کے ساتھ جہاد میں برابر شریک رہے۔ بعد شہادت سید صاحبؒ کے وہ ہندوستان اپنے وطن میں رہنے لگے۔ ان کے جسم مبارک پر گولیوں اور نیزوں کے متعدد نشانات تھے، جس کو ہم لوگوں نے دیکھا۔ انہوں نے ہم چند لڑکوں کو جن میں ہمارے اخ معظم مرحوم[2] تھے۔ ایک روز تہجد کی نماز پڑھائی اور دعاء ماثورہ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا الخ لکھ کر پڑھوائی، اور کہا کہ روزمرہ سویرے ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو۔ اسی کا اثر تھا کہ کافیہ تہذیب، سلّم، وغیرہ آسانی سے یاد کر لیتا تھا۔ اس زمانے میں میں کافیہ پڑھتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ نے تذکرہ[3] میں لکھا ہے کہ اسلامی ہند میں بنائے تجدید کی ابتداء حضرت مجدد سرہندیؒ (ف ۱۰۳۴ھ) نے کی۔ اور تعمیر و تزئین امام ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) کے ہاتھوں سے ہوئی۔ مگر "خاک و خون" سے کھیلنا "تتمۂ دودمان ولی اللّٰہی"

---

[1] یہ محلہ دارانگر (بنارس) کی مسجد کا حال تھا۔ جہاں اہلِ حدیث حضرات کی اکثریت تھی۔ دوسری جگہوں کا جو حال ہوگا۔ اسی پر قیاس کر لیجئے۔ والد ماجد فرماتے تھے کہ اُن دنوں عام طور پر مسجدوں میں امام باڑے ہوا کرتے تھے۔ اور اچھے اچھے عالم بھی اس پر ہاتھ رکھنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

[2] والد ماجد مولانا عبدالشکور مدظلہ اور میرے بڑے چچا مولانا عبدالرؤف صاحب مرحوم دونوں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی مولانا سید عبدالکبیر صاحب بہاری (ف ۱۳۳۱/۱۹۱۳، تراجم علمائے حدیث، صفحہ ۴۰۳، ۴۰۴) کی نگرانی اور سرپرستی میں دارانگر، بنارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور تکمیل کانپور اور علی گڑھ میں کی۔

[3] تذکرہ صفحہ ۲۴۴ — ۲۴۲

مولانا اسماعیل شہیدؒ (۱۱۹۶ــــ۱۲۴۶ھ) کے لئے مقدّر کیا گیا تھا۔ مولانا کے خیال میں تجدید و اصلاح کی تکمیل اور مقامِ امامت کی صحیح عملی تفسیر حضرت شہیدؒ دہلوی نے کی ہے۔ مولانا آزادؒ کو تمام جہادی سرگرمیوں میں، مولانا شہیدؒ ہی کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ استاذِ محترم مولانا سیّد سلیمان ندوی مدظلہ، سیّد صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ دونوں بزرگوں کو "تجدیدِ دین کی تحریک" کا امام سمجھتے ہیں[1]۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی "شہیدین" کو امام ولی اللہؒ کی تجدید کا تتمہ سمجھتے ہیں[2]۔ راقم کو مولانا ابوالکلام آزادؒ سے زیادہ اور ان دونوں بزرگوں سے تھوڑا سا مؤدبانہ اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک مجددِ سرہندیؒ اور امام ولی اللہ دہلویؒ کی تیار کردہ عمارت کی تکمیل حضرت شہید دہلویؒ کے پیر و مرشد حضرت سیّد شہید بریلویؒ کی ذاتِ گرامی سے ہوئی ہے اپنا اپنا تاثر[3] اور اپنا اپنا وجدان ہے۔

وللنّاسِ فیما یعشقون مذاہبٌ

راقم نے خود مولانا آزاد مدظلہ، کی خدمت میں ایک موقع پر (لکھنؤ کانگریس ۱۹۳۶ء) اپنا خیال پیش کیا تھا۔ مولانا نے جواب دیا۔ کہ میرا ذاتی تاثر وہی ہے۔ بہرحال اگر مرید و عقیدت مند ہی کی قسمت میں یہ بلند مرتبہ تھا، تو پیر و مرشد کے مراتبِ عالیہ کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔؟

دعوت کا اہم عنصر

سیّد صاحبؒ کی دعوت کا اہم عنصر جہاد فی سبیل اللہ ہے، اور یہی چیز اس تحریک

---

[1] مقدمہ سیرتِ سیّد احمد شہید

[2] تجدید و احیائے دین صفحہ ۷۰ــ۷۹

[3] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔ راقم کی کتاب "مولانا سندھیؒ اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر" صفحہ ۳۵ــ۴۰

تجدید وجہاد کو نجد کی دعوتِ توحید سے خاص طور پر ممتاز کرتی ہے۔ سید صاحبؒ کا کوئی وعظ یا مکتوب ترغیبِ جہاد سے خالی نہیں ہوتا۔ انہوں نے صرف 'وعظ' پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے مریدوں کے ساتھ گھر بار چھوڑ کر سرحد تشریف لے گئے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، سکھوں کے مظالم ان کے سامنے تھے۔ مسلمان عورتوں کی عصمت و آبرو محفوظ نہیں رہی تھی۔ ان کا خون حلال ہو چکا تھا۔ گائے کی قربانی ممنوع تھی۔ مسجدوں سے اصطبل کا کام لیا جا رہا تھا۔ غرض وہاں وہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ جس کا نقشہ عارف سیالکوٹی نے اپنے شعر میں کھینچا ہے :-

خالصہ شمشیر و قرآن را ببرد
اندر آں کشور مسلمانی بمرد

انہیں حالات[1] سے متأثر ہو کر سید صاحبؒ نے باضابطہ جہاد کا اعلان کیا۔ سکھوں کو پہلے اسلام کی دعوت دی۔ پھر معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ جدھر کا رُخ کیا کامیابی قدم لینے کو آگے بڑھی۔ سید صاحبؒ کی قوت روز بروز بڑھتی گئی۔ مجاہدین نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، آپ کی 'امارت' کا اعلان ہوا۔ (۱۲۴۲ھ) خطبوں میں آپ کا نام پڑھا جانے لگا۔ دُور اور نزدیک سے اطاعت اور معاونت کے پیام آنے لگے ـ ـ ـ ـ ـ مگر ہمارے بعض بزرگ

---

[1] ہم کہیں اوپر لکھ آئے ہیں کہ سید صاحبؒ کے دل میں جذبۂ جہاد بدوِ شعور ہی سے پرورش پا رہا تھا۔ اور آگے بڑھ کر اقامتِ دین کا مقصدِ بلند ان کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ ان کی دُور بین نگاہوں سے یہ بات بھی اوجھل نہیں تھی کہ اصل خطرہ کہاں ہے؟ اور جہاد کی مہم کا صحیح رخ کیا ہونا چاہیے؟ لیکن موقعِ جنگ اور پنجاب کے مخصوص حالات نے انہیں سکھوں سے نبٹ لینے پر مجبور کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ اصل حریف سے پنجہ آزمائی سیّد صاحبؒ کی شہادت کے بعد ہی ہوئی۔

کہتے ہیں کہ یہ "بیعتِ امارت" ڈکٹیٹر شپ کا اعلان تھی اور مجاہدین نے سید صاحبؒ کے دستِ مبارک پر "امامت و امارت" کی بیعت کر کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا۔ راقم عرض کرتا ہے، کہ اگر سید صاحبؒ کی امارت، ڈکٹیٹر شپ تھی تو پھر سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ کی خلافت بھی ڈکٹیٹر شپ تھی اور اگر یہ بیعت کوئی غلط چیز ہے، تو اس سے پہلے صحابہ کرامؓ نے بھی اس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ آخر ہم ساحرانِ فرنگ کی ابلہ فریبیوں کا کب تک شکار بنے رہیں گے؟ جمہوریت کی "نیلم پری" کا مکروہ چہرہ بے نقاب ہو، دنیا عارف سیالکوٹیؒ کی زبان سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اور آج یہ حقیقت بھی الم نشرح ہو چکی ہے

کز مغز دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

عرض یہ کر رہا تھا کہ سید صاحبؒ کی امامت و امارت پر باضابطہ بیعت ہوئی (۱۲ر جمادی الآخرة ۱۲۴۲ھ / ۱۱ر جنوری ۱۸۲۷ء) اور ہند، و بیرونِ ہند کے اہلِ نظر و فکر نے اس کی دلی تائید کی۔ لیکن اپنی بدنصیبی کا ماتم کن لفظوں میں کیا جائے؟ دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے اور آنکھوں میں خون اتر آتا ہے، جب کبھی ملاّنوں کے فتوے اور خوانینِ سرحد کی غداری یاد آتی ہے۔ مگر یہاں توجہ کرا کر کے کسی نہ کسی طرح رودادِ الم قلمبند کرنا ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ جاہل ملاّنوں نے مجاہدین کو "وہابی" کہنا شروع کیا۔ جن کی اصلاح و بہبودی اور امداد و معاونت کے لئے اس بے برگ و نوا سید زادےؒ اور اس کے جاں نثاروں نے ہجرت کی مشقتیں گوارا کیں۔ وہ خود جان کے دشمن ہو گئے۔ کھانے میں زہر بھی دیا گیا۔ پشاور فتح ہو چکا

ملاحظہ ہو:- مولانا سندھیؒ کی شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۱۷ - ۱۵۳ - ۱۴۸ (طبع [illegible])

تھا۔ مگر سردارانِ پشاور کی غداری کے باعث سید صاحبؒ کے مقرر کردہ عمال اور خاص اصحاب کا قتلِ عام ہوا۔ اور پھر اتنی بددلی ہوئی کہ وہ نواحِ پشاور کو چھوڑ کر وادیٔ کاغان سے متصل راج دواری کی وادی کو منتقل ہو گئے (شعبان ۱۲۴۶ھ)۔ وہاں بھی سکھوں سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ آخر بالاکوٹ میں وہ آخری معرکہ پیش آیا جس کا اجمالی تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ مقامی خوانین ذاتی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان میں سے ایک جماعت تو سید صاحبؒ کے ساتھ تھی اور کچھ لوگ سکھوں کے مددگار و معاون رہے۔ سکھوں کے ان مقامی ہمدردوں کو تمام راستوں اور پُرپیچ گھاٹیوں کا پورا پورا علم تھا۔ انہیں کی نشاندہی کی بدولت اس آخری معرکے میں سکھوں کو ناگہانی طور پر عقب سے حملہ آور ہونے کا موقع مل گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ مجاہدین جان پر کھیل کر لڑے۔ موت سامنے تھی اور شہادت کی آرزو دلوں میں بسی ہوئی۔ لڑے اور اس طرح کہ دشت و جبل نعرۂ حق سے گونج اٹھے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج بھی بالاکوٹ کے اِردگِرد اس نعرۂ حق کی گونج نہیں سنائی دیتی ہوگی ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مولانا اسماعیل شہیدؒ اور خود سید صاحبؒ نے بھی اسی معرکے میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ (۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ)

شہادت یا غیبوبت

بالاکوٹ کا حادثہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ شہداء کی تجہیز و تکفین بھی غیروں ہی نے کی۔ ان کی قبروں کا بھی ٹھیک علم نہیں۔ خود سید صاحبؒ نے بعض ایسی پیش گوئیاں کی تھیں، جن سے بعض کمزور دلوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ سید صاحبؒ شہید نہیں ہوئے، بلکہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں، اور دوبارہ ظاہر ہو کر دنیا کو شرک و بدعت سے پاک کریں گے ——— یہ خیال ایک عرصہ تک سید صاحبؒ کے عقیدت مندانِ خاص کے دلوں

میں جاگزیں رہا۔ اسی انتظار میں کتنے بیٹھے رہے اور بے نیلِ مرام اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ سیّد صاحبؒ کے عقیدت مندوں اور ان کے نقشِ قدم پر "گھر بار لٹانے والوں" کا سب سے بڑا قافلہ[1]، صادق پور[2] (پٹنہ) میں آباد تھا۔ (وہ چمن تو ۱۸۶۵ء کی خزاں میں اُجڑ چکا۔ مگر اس کی نشانیاں "آشیانے" کے اِرد گرد باقی ہیں اور ان کی اولاد اب تک وہیں مقیم ہے) ان میں یہ خیال عرصۂ دراز تک قائم رہا۔ بعض بڑے مخلص اور متبعِ سنت علماء اس "توہّم" کے شکار ہوئے۔ اور شاید اب بھی اُن کے دِلوں سے یہ عقیدہ نہیں نکل سکا ہے۔ گو درایتِ عقل کی رو سے وہ سیّد صاحبؒ کی شہادت کو تسلیم کرتے ہیں۔

—— یہ فرطِ محبت کی 'لغزش' تھی۔ گو 'لغزش' بہر حال لغزش ہے اور یہ کوئی معمولی لغزش نہیں، پھر بھی ان کے حالات پر نظر رکھ کر زبانِ طعن دراز کرنے سے پہلے ذرا سوچ لینا چاہیئے مولانا ابوالکلام آزاد مدظلّہ، جو مولانا محمد یوسف صاحب رنجور عظیم آبادی صادق پوری ف ۱۳۴۱ھ

---

[1] خاندان صادق پور کے خاندانی مکان کو عرفِ عام میں "قافلہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

[2] صادق پور، شہر عظیم آباد، پٹنہ کا ایک محلّہ ہے۔ اس کی آبادی پرانے شہر (موجودہ پٹنہ سٹی) کے مغربی دروازہ سے بالکل ملی ہوئی ہے۔ یہاں شرفائے بنو ہاشم کا ایک مشہور خاندان عرصۂ دراز سے آباد ہے۔ جو علمی وقار اور دینی وجاہت، ہر لحاظ سے دور و نزدیک عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی خاندان کے گوہرِ شب چراغ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) تھے جو ابتدائی زمانہ ہی میں لکھنو میں سیّد صاحبؒ سے بیعت ہوئے اور پھر سارے خاندان کو اس 'راہ' کا مسافر بنا دیا۔ جس مقام پر ان کا پُرانا عالی شان مکان (جو دعوتِ جہاد کا عرصہ دراز تک مرکز رہا ہے اور اسی مناسبت سے 'قافلہ' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) تھا، اب وہاں پٹنہ میونسپلٹی کی عمارت قائم ہے۔

—— اب یہ سوال کہ پٹنہ سٹی میونسپلٹی کی عمارت کس طرح تعمیر ہوئی؟ اور اس عالی شان محل کا نام و نشان بھی آج کیوں نہیں ملتا؟ اس کا جواب آئندہ صفحات میں کچھ مل سکے گا۔

کی صحبت میں عرصے تک رہے اور اس لئے اہلِ صادق پور کے احوال و کیفیات سے اچھی طرح واقف ہیں) کا تاثر یہ ہے کہ گرتے ہوئے دلوں کو "تھامنے" کے لئے یہ شوشہ چھوڑا گیا تھا ـــــــ ہم نے ابھی کہا ہے کہ لغزش بہرحال لغزش ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ سچے اور بے ریا لوگوں پر افترا اور بہتان تراشا جائے۔

حکمتِ ولی اللّٰہی، کے عَلَم بردار مولانا عبید اللہ سندھی (ف ۱۳۶۳ھ) نے مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) اور اُن کے دوسرے رفیقوں اور ماننے والوں کو شیعیت، اور زیدیت کا نام لگا کر جس طرح مطعون اور بدنام کرنے کی ناروا کوشش[۱] کی ہے، اُسے تحریکِ تجدید و جہاد، کا مؤرخ کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہم مولانا سندھی کی قربانیوں اور علم و فضل کا انکار نہیں کرتے، بلکہ سچے دل سے ان کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن سید شہید اور ان کے "اصحابِ باصفا" کے مُنہ آنا ان کو زیب نہیں دیتا۔ اور اگر قربانیوں اور فداکاریوں، کے طفیل مولانا سندھی کی لغزشیں قابلِ درگذر ہیں (جیسا کہ ان کے ایک عقیدت مند نے لکھا ہے) تو پھر سید شہید کے اصحابِ خاص کی فروگزاشتیں اور بھی زیادہ قابلِ درگذر ہوں گی ؟ کیا وہ اور ان کے معتقدین ان مجاہدینِ راہِ حق کی قربانیوں اور فداکاریوں سے بے خبر ہیں ؟

اصلی نصب العین تاسیسِ حکومتِ الٰہیہ

پچھلے دو تین برسوں میں حضرت سید شہید اور ان کی تحریکِ تجدید و جہاد، کے متعلق جہاں اور غلط بیانیاں کی گئی ہیں، وہاں یہ بھی کہا گیا ہے[۲] کہ سید صاحب کی جماعت دہلی کی

---

[۱] ملاحظہ ہو: مولانا سندھی کی شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک: صفحہ ۱۵۹، ۱۶۱، اور راقم کی کتاب مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر: صفحہ ۸۴، ۸۷

[۲] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۷۵، اور مولانا سندھی اور ان کے افکار پر ایک نظر صفحہ ۱۱، ۱۲

سلطنت کی "کمزوری کو دور کرنے کے لئے کھڑی" ہو رہی تھی۔ حالانکہ سید صاحبؒ اور ان کے مقصدِ جہاد کی اس سے زیادہ اور کوئی تنقیص نہیں ہو سکتی۔ سید صاحبؒ مکمل اسلامی نظام کے داعی تھے۔ دہلی کی حکومت کو ان کے بلند مقاصد سے کیا نسبت ؟ کون نہیں جانتا کہ دہلی کی حکومت خاندانی شخصی حکومت تھی اور خلافتِ راشدہ کے نمونے پر حکومتِ الٰہی کی تاسیس کرنا سید صاحبؒ کا نصب العین تھا۔ سید صاحبؒ کا مقصد و نصب العین اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہونا چاہیئے تھی۔ ان کا جہاد خالص اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے تھا۔ یہ موافق و مخالف سب پر عیاں ہے، مگر جب ایک غلط بیانی علم و تحقیق کا جامہ پہن کر منظرِ عام پر آچکی ہے، تو اس کی صاف و واضح تردید بھی ضروری ہے۔ لیجئے، جہاد و ہجرت اور نصبِ امامت کا مقصدِ عالی خود سید صاحبؒ کی زبان سے سنئے۔ سردار سلطان محمد خان اور سردار سعید محمد خان کو تحریر فرماتے ہیں۔

ربِ غیور کہ علیم بذاتِ الصدور است آگاہ است بریں معنی کہ ایں جانب را از قبولِ ایں منصب غیر از اقامتِ جہاد بر وجہ مشروع و حصول معنیٰ انتظام در عسا کر اہلِ اسلام غرض و دیگر از اغراضِ نفسانیہ ـ ـ ـ ـ نیست ـ ـ ـ ـ ـ ـ آرے ایں قدر آرزو دارم کہ در اکثر افرادِ بنی آدم بلکہ در جمیع اقطارِ عالم احکامِ ربِ العالمین کہ مسمّٰی بشرعِ متین است بلا منازعت احدے نافذ گردد۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	ربِ غیور جو کہ دلوں کا حال اچھی طرح جانتا ہے، اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس منصب (امامت) کے قبول کرنے سے اس کے سوا میری کوئی دوسری نفسانی غرض نہیں کہ جہاد کو شرعی طریقے پر قائم کیا جائے اور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو۔ ہاں! اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افرادِ انسانی بلکہ تمام ممالک میں ربِ العالمین کے احکام جن کا نام شرعِ متین ہے، بلا کسی کی مخالفت کے جاری ہو جائیں۔

سیرت سید احمد شہیدؒ : صفحہ نمبر ۱۱۰ - ۱۱۱

کیا اس کے بعد بھی کہا جائے گا کہ سید صاحبؒ دلّی کی حکومت کی کمزوری دور کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے؟

مشہور خلفاء

سید صاحب کے دستِ مبارک پر بے شمار علماء نے جہاد و اصلاح کی بیعت کی۔ ایک اچھی خاصی تعداد سرحد و پنجاب کے معرکوں میں کام آئی۔ دوسروں نے شرک و بدعت کے مٹانے میں بڑی نمایاں خدمتیں انجام دیں اور بلاشبہ آج اسلامی ہند میں جو کچھ صحیح الخیالی اور اتباعِ "سنّت" کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ ان ہی اربابِ صدق و صفا کی کوششوں کا رہینِ منّت ہے۔

یوں تو خلفاء کی تعداد بہت ہے لیکن ان میں مشہور ترین اصحاب کے نام یہ ہیں۔

(۱) مولانا عبدالحیؒ بڈھانویؒ (ف ۱۲۴۳ھ) (۲) مولانا اسماعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ)
(۳) مولانا ولایت علی صادق پوریؒ (ف ۱۲۶۹ھ) (۴) مولانا محمد علی رام پوریؒ (ف ۱۲۵۰ھ)
(۵) مولانا سخاوت علی جون پوریؒ (ف ۱۲۷۴ھ) (۶) مولانا کرامت علی جون پوریؒ (ف ۱۲۹۰ھ)۔

ان میں مولانا عبدالحیؒ داماد مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اپنے پیر و مرشد کی زندگی ہی میں وفات پاگئے۔ مولانا اسماعیلؒ نے بالاکوٹ میں اپنے پیر اور امیر کا حق رفاقت ادا کیا۔ مولانا سخاوت علی (مولود ۱۲۲۷ھ) اور مولانا کرامت علی (مولود ۱۲۱۵ھ) نسبتاً کم عمر تھے۔ مولانا سخاوت علی نے مکہ معظمہ کو ہجرت کی، اور وہ بڑی مدت تک [illegible] شیخ کے

ل مزید تفصیل کے لئے: سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۲۰، ۱۹۵ ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

مسلک اور طریقے پر قائم رہے، مولانا کرامت علی (ف سنہ ۱۲۹۰ھ) نے بڑی عمر پائی اور بنگال میں ایک عرصے تک وہ تبلیغی دورے کرتے رہے، مگر ان کی روش اپنے شیخ اور ان کے اصحابِ خاص کے مشرب سے الگ ہو گئی تھی۔ رہ گئے۔ مولانا محمد علی رام پوری اور مولانا ولایت علی صادق پوری۔ ان دونوں بزرگوں کو خود سید صاحبؒ نے میدانِ جہاد ہی سے مدراس اور دکن تبلیغی مہم پر بھیج دیا تھا اور دونوں نے اپنے فرائض سچے جوش اور ولولے کے ساتھ انجام دیئے۔ شہادت کی خبر ان دونوں بزرگوں کو علی الترتیب مدراس اور دکن ہی میں ملی۔ اس کے بعد مولانا محمد علی وطن کو آئے، پھر دوبارہ مدراس تشریف لے گئے (سنہ ۱۲۵۱ھ) اور وہاں آپ کو علماء سوء اور بدعت نواز مسلمانوں نے بڑی تکلیفیں دیں۔ اس لئے دوسری مرتبہ وہاں زیادہ قیام نہ ہو سکا، اور واپس چلے آئے (اواخر سنہ ۱۲۵۲ھ) اپنی عمر کے آخر چھ سال آپ نے تذکیر و تبلیغ میں صرف کئے اور سنہ ۱۲۵۸ھ میں وفات پائی۔

لہ مجاہدین اور اتباعِ سید احمد شہیدؒ کے سب سے بڑے واقف کار مسٹر جیمس اوکنلی Jamesokinley نے شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب برطانوی حکومت کے مؤید اور وہابیوں کے پکے مخالف تھے۔ Persistent opponant of wahabis یہ تصدیق نامہ راج محل (بہار) میں ۱۰ راکتوبر سنہ ۱۸۷۰ء کو دیا گیا تھا۔ جسے خود ان کے پوتوں نے فخریہ سنہ ۱۹۱۴ء کو طبع کرایا تھا۔ (وہ خوبصورت اور نظر فریب پمفلٹ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے) اس میں ان کے صاحبزادے مشہور ادیب مولوی عبدالاول صاحب جون پوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے۔ ان کے علاوہ راقم بھی یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ عقائد و اعمال میں وہ سید صاحبؒ کے اصحابِ خاص کی روش سے بالکل الگ تھے۔ سیرت سید احمد شہیدؒ طبع دوم صفحہ ۳۷۸ - ۳۷۰ کے بیانات سے غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ اس لئے راقم نے ضروری خیال کیا کہ یہ حقیقت واضح کر دی جائے۔

چوتھا باب

سیّد صاحبؒ کے بعد

مولانا ولایت علیؒ صادق پوری

ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ حادثہ بالاکوٹ کے وقت سید شہیدؒ کے دو بڑے اور ممتاز رفیق مدراس اور دکن میں تبلیغی خدمات پر مامور تھے، مشیّتِ الٰہی یہی تھی کہ سیّد صاحبؒ کے بعد بھی "آگ اور خون" کی ہولی کھیلی جاتی رہے، میدانِ جہاد سے ان دونوں بزرگوں کی دوری[1] اور سلامتی میں یہی رازِ پنہاں معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال مولانا محمد علیؒ رام پوری (ف ۱۲۵۸ھ) فاجعہ شہادت (۱۲۴۶ھ) کے بعد بارہ سال تک خاموش طریقہ سے تبلیغ و اصلاح کے مفید کام کرتے رہے، مگر وہ کہ جس کے کندھوں پر سیّد شہید کی جانشینی کا بار پڑ گیا تھا، اس کی روش اس خاموش طریقہ "تبلیغ" سے الگ رہی ———— فاجعہ بالاکوٹ کے بعد تمام ملک پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ جماعت تتر بتر ہو گئی۔ اچھوں اچھوں کے قدم لڑکھڑا

---

[1] مولانا ولایت علیؒ صاحب پر میدانِ جہاد سے علیحدگی اور سیّد صاحبؒ کی جدائی بہت شاق تھی۔ سیّد صاحب نے آپ سے فرمایا کہ مولانا ہم آپ کو تخم کر کے اُٹھاتے ہیں یعنی اس ایک تخم سے ہزاروں درخت پیدا ہوں گے۔

رہے تھے۔ جہاد کا سارا کام درہم برہم ہوا چاہتا تھا، کہ عظیم آباد، پٹنہ محلہ صادق پور کے ایک فرد نے یہ گرتا ہوا علم اپنے ہاتھوں سے تھام لیا اور زندگی بھر اپنے سینے سے لگائے رکھا اور پھر اس "فردِ کامل" کے بعد اس کے بھائیوں، بھتیجوں، عزیزوں اور ماننے والوں نے جس طرح اپنے خون سے اس نخلِ خزاں دیدہ کی آبیاری کی ہے، وہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔ افسوس کہ ولیم ولسن ہنٹر W. W. Hunter کی گمراہ کن اور اشتعال انگیز کتاب ہندوستانی مسلمان[1] The Indian Musalman کے سوا ان کشتگانِ خنجرِ تسلیم کے متعلق اور کوئی چیز اردو میں نہیں آئی۔ مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری (مولود ۱۲۵۲ھ اسیر انڈمان $\frac{۱۸۶۴ء}{۱۲۸۰ھ}$، $\frac{۱۸۸۳ء}{۱۳۰۰ھ}$، متوفی در عظیم آباد ۱۳۴۱ھ) کی تذکرہ صادقہ، مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری (اسیر انڈمان، متوفی ۱۹۰۵ء) کی تواریخ عجیب میں بکھرے ہوئے معلومات ملتے ہیں، مگر ان کتابوں کو اب پڑھتا کون ہے؟ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے سیرت سید احمد شہیدؒ میں انہیں مآخذ سے لے کر اچھی خاصی مرتب اور مسلسل روداد الم، قلم بند کر دی ہے، مگر آنسو کے ان چند قطروں سے اس پاک اور طاہر خون کا حق تو ادا نہیں ہو سکتا، جو مسلسل سو۱۰۰ برس (۱۸۳۱ء، ۱۹۳۴ء) بنگال کے مشرقی اضلاع سے لے کر سرحد اور ماورائے سرحد کی پتھریلی اور پیاسی زمینوں تک بے دریغ

---

[1] اللہ مغفرت کرے، مولوی طفیل احمد صاحب مرحوم نے ہنٹر کی کتاب کے اتنے اقتباسات اپنی کتابوں میں دیئے اور ایک مشہور عالم نے اپنی تقریروں میں اس کثرت سے اس کے حوالے پیش کئے کہ عام طور پر لوگوں کو اس دریدہ دہن مصنف اور اس کی کتاب سے "ہمدردی" پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ یہ کتاب اس قدر کی مستحق نہیں تھی نہ اس کی تحقیق ہی اپنی ہے اور نہ اس کی زبان ہی شائستہ ہے۔ اس کی "تہذیب" و "شائستگی" کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سید شہیدؒ کو ڈاکو (Robber) رہزن (Bandit) اور فریبی (Imposter) کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ (نیا اڈیشن صفحہ ۴، ۵، ۴۳)

بہا یا گیا۔ حق یہ ہے کہ ان بلاکشانِ راہِ عزیمت کا ادنیٰ حق بھی اب تک ادا نہیں ہو سکا ہے۔ خود یہ گنہگار اس "کوتاہی" کا معترف ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں اس فرضِ کفایہ سے سبکدوش ہونے کے قابل ہو۔

راقم کا کچھ عجب حال ہے، جہاں مجاہدینِ راہِ حق کا ذکر آیا، وہ تمام اگلی اور پچھلی بے انصافیاں اور غلط بیانیاں ایک ایک کر کے یاد آنے لگتی ہیں، جو "اربابِ ہوا و ہوس" نے ان بزرگوں کے متعلق روا رکھی ہیں۔ اور راہوارِ قلم بے قابو ہونے لگتا ہے ـــــــ

بہرحال عرض یہ کرنا تھا کہ مشہدِ بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) پر سید صاحبؒ کی شروع کی ہوئی تحریکِ تجدید و جہاد بالکل ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد قیادت کی باگ مولانا ولایت علیؒ صادق پوری عظیم آبادی (مولود ۱۲۰۵ھ) نے اپنے ہاتھوں[1] میں لے لی۔ ابھی وہ دکن میں تبلیغ و ارشاد کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ فاجعہ بالاکوٹ پیش آیا۔ امیر و شیخؒ کی شہادت کی خبر سنتے ہی وہ عظیم آباد واپس ہوئے اور دعوت و تبلیغ کی ازسرِ نو تنظیم شروع کی۔ بنگال، بہار، دکن، مدراس، مختلف صوبوں کو مبلغ بھیجے، ردِّ بدعت پر متعدد کتابیں شائع کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے خاندان میں عمل بالسنت کی تجدید کی۔

---

[1] یوں تو مشہدِ بالاکوٹ کے بعد ہی مجاہدین کا ایک گروہ سرحد پار پہنچ گیا تھا۔ اور مولانا ولایت علیؒ کے سرحد پہنچنے (۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء) سے پہلے وہ مختلف امراء، (شیخ ولی محمد پھلتی، مولوی نصیر الدین دہلوی اور حاجی سید عبدالرحیم سورتی اور مولانا عنایت علیؒ) کی سرکردگی میں اپنا فرض انجام دیتے رہے۔ لیکن اندرونِ ہند و بیرونِ ہند مجاہدین اور ان کے ہمدرد انہیں کو اپنا "امیر" سمجھتے تھے۔ اور اسی لئے جب وہ سرحد پہنچ گئے تو "مرابطین" نے فوراً آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ باقی ملک کے اندر، تو وہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ہی سے، امیر کی حیثیت سے دعوت و تبلیغ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

صوبہ بہار و بنگال میں نکاحِ بیوگان کا آغاز آپ[1] ہی کے خاندان سے شروع ہوا، جس طرح ہندوستان میں نکاحِ بیوگان کی پہلی مثال خود سید شہیدؒ نے اپنے خاندان میں قائم کی تھی۔ اس نکاح کا بڑا شور و غل رہا، پھر بڑے حضرت (مولانا ولایت علی صاحبؒ اپنے خاص حلقوں میں اس لقب سے یاد کئے جاتے ہیں) نے اس سُنّت کو خوب جاری کیا اور ہزاروں بیوہ عورتوں کے نکاح کروائے۔

آپ کی ذات سے جو احیائے سُنّت ہوا۔ اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ عہدِ حاضر کے روشن خیال حضرات کو یہ چیزیں معمولی اور حقیر معلوم ہوں گی۔ لیکن جب آپ آج سے سو برس پہلے کے حالات کا تصوّر کریں گے، تو ان کی اہمیت معلوم ہوگی اور ان علماءِ حق کی جرأت، اور جذبۂ اتباعِ سنّت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اگر یہ "چیزیں" اقامتِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی دعوت سے الگ، صرف جزوی اصلاح کی حیثیت سے کی جائیں، تو یقیناً زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ مگر جب اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت کے ساتھ اقامتِ دین کی تحریک کے ضمن میں یہ اصلاحات بھی ہوتی جائیں، تو بڑی بات ہے۔

ان بزرگوں نے یہ سُنّتیں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے زندہ کی تھیں، اور ہمارا یہ حال ہے کہ آج بھی ہماری زندگی ہندوانہ رسوم سے پاک نہیں ہو سکی ہے۔ نکاحِ بیوگان کے علاوہ اور جن سُنّتوں کا احیا مولانا ولایت علیؒ کے دَم قدم سے ہوا، ان کا مختصر ذکر یہاں کیا جاتا ہے

---

[1] مولانا ولایت علیؒ نے یہ سنت پہلے پہل خود اپنی ذات سے زندہ کی۔ مولوی الٰہی بخش صاحب جعفریؒ صادق پوری (و ۱۲۱۰ھ)۔ ۱۲۴۶ھ نے اپنی بیوہ لڑکی مسماۃ جمیلۃُ النّسار (جن کے شوہر مولوی قمر الدّین جہادِ سرحد میں معرکۂ بالاکوٹ سے چھ ماہ پیشتر شہید ہو چکے تھے) کا عقد آپ سے کر دیا۔ مولاناؒ کے چھوٹے بیٹے مولوی محمد حسن ذبیح (ف ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) جنہوں نے سولہ سال کی عمر میں اسیرانِ بلا (۱۸۶۴ء / ۱۲۸۰ھ) کے مقدمات کی مجبر العقول طریقے پر پیروی کی۔ اسی بطن سے پیدا ہوئے (۱۲۶۴ھ)۔

۱۔ مولوی اکبر علی فرزند مولوی الٰہی بخش صاحب جعفری (ف ۱۲۷۵ھ) کا ہیضہ میں انتقال ہوا، تو ان کی بیوہ اہلیہ (بنت شاہ محمد حسین صاحب ف ۱۲۷۶ھ) کا غائبانہ نکاح اپنے منجھلے بھائی مولوی عنایت علی صاحب غازیؒ سے کرکے نیک بی بی کو ان کے پاس بنگال بھیج دیا۔ جہاں وہ تبلیغ وارشاد میں مصروف تھے۔ جیسے نجاشی (بادشاہ حبشہ) نے امّ المومنین امِّ حبیبہؓ بنتِ ابوسفیان کا نکاح حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے کرکے مدینہ منورہ بھیج دیا تھا۔ (اس خاندان میں یہ دوسرا نکاح ثانی تھا)۔

۲۔ ایک شخص عبدالغنی نگرنہسوی (جو زمرۂ مساکین سے تھے) کا عقد ایک بیوہ عورت سے تعلیمِ قرآن مہر قرار دے کر کر دیا۔

۳۔ شرفائے بہار میں تعدّدِ ازدواج معیوب تھا (اور آج بھی معیوب سمجھا جاتا ہے) اور ایک بیوی کے ہوتے ہوئے برابر کی جوڑ میں دوسرا نکاح کرنا تو گویا حرام سمجھا جاتا تھا اس لئے آپ نے اپنے خاندان میں ایسی دو شادیاں کرائیں اور ان میں تمام برادری اور عقیدت مندوں کو دعوت دے کر اتباعِ سُنّت کی ترغیب دی۔

۴۔ آپ نے اپنے دو صاحبزادوں مولوی عبداللہ اور مولوی ہدایت اللہ کا عقدِ نکاح اپنے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین (ف ۱۲۷۴ھ) کی دو لڑکیوں کے ساتھ اس سادگی کے ساتھ انجام دیا کہ گھر کے موجود کپڑے (وہ بھی پیوند لگے ہوئے) پہنا دئے اور کوئی نیا کپڑا دلہا دلہن کے لئے تیار نہیں کرایا گیا۔ آپ نے یہ سُنّت بھی پانچ ہزار آدمیوں کے مجمع میں ادا کی۔

تنظیم و تبلیغ

تنظیم و تبلیغ کے سلسلے میں مندرجہ ذیل انتظامات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۔ شاہ محمد حسینؒ صاحب (ف ۱۲۷۶ھ) خلیفہ حضرت سید صاحبؒ کو مسجد نمونہیہ

(صادق پور سے متصل شہر پٹنہ کا ایک محلہ ------- یہ مسجد آج تک اسی خاندان کی نگرانی میں ہے) کا امام اور چھپرہ، مظفر پور اور بہار کے دوسرے اضلاع میں تلقین و ہدایت کے لئے مقرر کیا۔

۲۔ اپنے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی غازی (ف ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۸ء) کو اہلِ بنگال کے ارشاد و ہدایت کے لئے روانہ کیا۔

۳۔ مولوی زین العابدین اور مولوی محمد عباس حیدر آبادی کو اڑلیسہ اور صوبہ الٰہ آباد (موجودہ یو، پی کے مشرقی اضلاع) کی طرف عام تبلیغ کے لئے بھیجا۔

۴۔ شہر پٹنہ، نواب فخر الدولہ کی مسجد میں دوسرا جمعہ قائم کیا۔ جہاں پر ہر جمعہ خود وعظ فرماتے۔

۵۔ دینیات کی تعلیم کے لئے گھر پر ظہر اور عصر کے درمیان قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ آپ کے بڑے بیٹے مولوی عبداللہ (ف ۱۳۲۰ھ) قاری ہوتے۔ دوسرے علماء تفسیر کی کتابیں ہاتھ میں لے کر بیٹھتے۔ علماء کے علاوہ عام مریدوں اور معتقدوں کی بڑی تعداد موجود ہوتی۔ قرآن مجید اور بلوغ المرام کا لفظی ترجمہ مردوں عورتوں اور بچوں کو پڑھواتے۔

۶۔ شاہ محمد اسحاق (ف ۱۲۶۲ھ) سے شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمۂ قرآن اور مولانا شہید کے رسائل منگوا کر پہلے مطبع حسینی، لکھنؤ میں طبع کرانے کی کوشش کی۔ مالکِ مطبع کے انکار پر، آپ نے یہ خدمت اپنے ایک رفیق و عقیدت مند مولوی بدیع الزماں صاحب بردوانی کے سپرد کی۔ جنہوں نے خاص طور پر ایک ٹائپ پریس خرید کر پہلی مرتبہ یہ کتابیں چھپوائیں۔

تبلیغ و تذکیر کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولانا ولایت علی کا وعظ بہت پُراثر ہوتا ۔ نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ) نے ان کے قنوج آنے اور وعظ کی تاثیر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے "بلوغ المرام" کی شرح مولانا

ہی کی ترغیب سے لکھی تھی۔ نواب صاحبؒ فرماتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔ پھر مولوی ولایت علیؒ، مولوی عنایت علیؒ قنوج میں تشریف لائے۔ میرے مکان پر آئے۔ اپنے اہلِ بیت کو واسطے ملاقاتِ والدۂ مرحومہ کے بھیجا۔ جامع مسجد قنوج میں چند جمعہ تک وعظ کہا۔ مجھ سے کہہ گئے کہ تم کتاب بلوغ المرام ضرور پڑھنا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ برس کا ہوں گا۔ اس کہنے کا نتیجہ بعد ایک مدتِ درازکے یہ ظاہر ہوا کہ میں نے بلوغ المرام کی شرح لکھی۔ جو اثرِ سریع میں نے وعظ مولوی عنایت علی مرحوم میں پایا، وہ کسی میں نہ دیکھا نہ سُنا۔ ان کے پاس بیٹھنے سے دل دنیا سے سرد ہو جاتا تھا اور دین کا جوش تہِ دل سے اُٹھتا تھا۔ یہ مصرعہ میں نے انہیں سے یاد کر لیا تھا۔

ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے"[1]

حج وجہاد

مولانا ولایت علیؒ خود بھی بنگال تشریف لے گئے۔ شہروں اور دیہاتوں کا دورہ کیا۔ پھر اپنے مرشد وامیر کی اتباع میں آغازِ جہاد سے پہلے حجِ بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور اسی سلسلے میں یمن اور دوسرے مقامات کی سیاحت کی اور یمن کے نامور محدث وعالم قاضی محمد بن شوکانیؒ (ف ۱۲۵۰ھ) سے حدیث کی سند حاصل کی۔ اور ان کی بعض[2] تصانیف ساتھ لائے۔ ان کی یہی ادا ہمارے مولانا سندھیؒ کو ایک آنکھ نہیں[3] بھاتی۔ پتہ نہیں، بیرونِ ہند کے کسی عالم اور

---

[1] ابقاء المنن بالقاء المحن: صفحہ نمبر ۱۲

[2] الدّر البھیّۃ کا وہ نسخہ جو مولانا ولایت علیؒ یمن سے ساتھ لائے تھے، اب تک صادق پور میں محفوظ ہے اور راقم الحروف کی نظر سے گزر چکا ہے۔

[3] ملاحظہ ہو۔ مولانا سندھیؒ اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر صفحہ: ۸۸-۸۷

محدثت سے استفادہ کیوں جرم قرار دیا جاتا ہے؟ اسلام تو اس قسم کی ملکی اور وطنی حد بندی کا قائل نہیں۔
واپسی کے بعد اپنے سگے بھائی مولانا عنایت علی غازیؒ کو سید ضامن شاہ (جو کاغان کے
رہنے والے اور ان دِنوں سکھوں سے برسرِ پیکار تھے) کی طلب پر مقامِ جہاد کی طرف روانہ کیا۔
پھر خود بالاکوٹ پہنچے اور مجاہدین کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔[1]
اس وقت کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ اور مجاہدین کے درمیان جنگ جاری تھی۔ راجہ کو
شکست ہوئی اور اس نے انگریزوں کے سائے میں جا کر پناہ لی۔[2] جو اس وقت تک پنجاب کے

---

[1] ایک اور قلمی رسالے میں جو ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) کو میدانِ جہاد سے بھیجا گیا ہے،

مولانا ولایت علیؒ کے موقع پر پہنچنے کا حال ان الفاظ میں درج ہے:۔

"الحمد للہ علیٰ احسانہ و کمالِ منّہ و کرمہ کہ بتاریخ ہفدہم شہر شوال روز جمعہ ۱۲۶۲ھ جناب حضرت مولانا

..........مظہر کرامات لم یزلی..........مرشدنا و امیرنا مولوی ولایت علی صاحب ادام اللہ برکاتہ و انوارہ

..........مع تمام اہلِ قافلہ و آلات و اسباب و خیل..........محض از فضلِ ربّ الارباب از میانِ ہجوم اعداء

بحکومتِ اہلِ اسلام جلوہ افروز شدند"

[2] صورتِ حال کے سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے:۔

(الف) گلاب سنگھ، سکھوں کے ماتحت صرف جموں کا گورنر تھا۔ کشمیر کی گورنری امام الدین کے سپرد تھی اور بالائی ہزارہ اس زمانہ میں کشمیر کے ماتحت تھا۔

(ب) جب تک سکھ برسرِ اقتدار رہے، مجاہدین کی لڑائیاں ان سے ہوتی رہیں۔

(ج) رنجیت سنگھ کی وفات (۱۸۳۹ء) کے بعد سکھ حکومت خانہ جنگی کے باعث کمزور ہو گئی تو خوانین ہزارہ اور مجاہدین نے شمالی ہزارہ کے بڑے حصے پر قبضہ جما لیا۔

(د) نومبر ۱۸۴۵ء میں انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ ہوئی۔ اس میں مجاہدین اور خوانین کو مزید استحکام کا موقع ملا۔

(ہ) گلاب سنگھ اس جنگ میں الگ رہا تھا۔ اس لئے جنگی خرچ لے کر جموں کے علاوہ کشمیر بھی اسے دے دیا گیا ——— اس کے بعد مجاہدین کو براہِ راست انگریزوں سے سابقہ پڑا۔

ایک معقول حصے پر قابض اور ملکی معاملات میں پوری طرح دخیل ہو چکے تھے۔ [۱۸۴۷ء تا دو برس بعد (۱۸۴۹ء) پھر جنگ ہوئی، اور نہ صرف پنجاب، بلکہ سکھوں کا پورا علاقہ انگریزی عملداری میں آگیا۔]

حکومت نے مولانا ولایت علیؒ کو اطلاع دی کہ اب گلاب سنگھ پر حملہ کرنا خود انگریزی حکومت سے لڑائی مول لینا ہوگا۔ حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ جب تک ان پر براہِ راست زد نہ پڑے، مجاہدین سے ٹکر نہ لی جائے اور انھیں سکھوں سے لڑنے دیا جائے۔ مجاہدین اور سکھوں میں سے جس کی بھی شکست ہو سرکارِ انگریزی کا بہر حال فائدہ تھا۔

اسی لیے شروع شروع میں مجاہدین سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ لیکن جب پنجاب کا بڑا حصہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ تو مجاہدین حکومت کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے۔ مجاہدین بھی خواہ مخواہ حکومت سے نبرد آزما ہونا خلافِ مصلحت خیال کرتے تھے۔ کوئی فریق ایک دوسرے سے مطمئن نہیں تھا کہ گلاب سنگھ کے سلسلے میں حکومت نے دھمکی دی۔ ابھی گفت و شنید کا سلسلہ جاری تھا کہ جاسوسوں نے باشندوں کو بھڑکایا اور انھوں نے مجاہدین کے ساتھ شرمناک غداری کی۔ ایک روز مقرر کر کے سارے علاقے میں ان غریب الوطن "مہاجروں"[1] کا قتل عام کرا دیا۔ اور سیّد ضامن شاہ (جس کی درخواست پر مولانا عنایت علی کو بھیجا گیا تھا اور جس کی تمام جائداد مجاہدین کی امداد و اعانت سے واپس مل چکی تھی) نے بھی بے وفائی کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد مولانا نے سوات بنیر کا رخ کرنا چاہا مگر سرکارِ انگریزی[2] مزاحم ہوئی۔ ناچار حکومت کے پیدا کردہ حالات سے

---

[1] یہ تذکرۂ صادقہ کی روایت ہے (صفحہ ۱۲۲، ۱۲۵) مگر اس غداری اور قتل عام کا ثبوت اور کہیں نہیں ملتا۔

[2] مولوی عبدالرحیم صاحب نے تذکرۂ صادقہ میں اس "مزاحمت" کی تفصیل نہیں کی۔ سرکاری دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کے بعد درۂ ڈب (Doob) کے مقام پر مجاہدین اور انگریزی فوج کے درمیان بھی لڑائی ہوئی، جس میں مجاہدین کو شکست ہوئی اور یہ دونوں بھائی گرفتار کر کے حراست میں پٹنہ بھیج دیے گئے۔ انگریزی فوج کی کمان جنرل ایبٹ (Abbott) کے ہاتھ میں تھی۔ (صفحہ ۱۰)

مجبور ہو کر اپنے بھائی اور خاص رفیقوں کے ساتھ انھوں نے وطن کی راہ لی۔ پھر بھی ان کے ساتھیوں کی ایک بڑی تعداد میر اولاد علی (ف ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء) ساکن سورج گڈھا[1] ضلع مونگیر کی قیادت میں خفیہ طریقے پر ستھانہ پہنچ گئی۔ واپسی پر دونوں بھائیوں کو پٹنہ کے مجسٹریٹ کے روبرو حاضر ہو کر دو سال کے لئے مچلکہ دینا پڑا[2]۔

مولانا ولایت علیؒ دو سال تک وطن میں رہ کر تبلیغ و تذکیر کرتے رہے۔ مختلف علاقوں میں خاص مبلّغ بھیجے۔ اپنے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی غازیؒ کو بھر بنگال بھیجا اور تمام مشاغل اس طرح جاری کر دئے کہ عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ اب مولانا سرحد کا رُخ نہیں کریں گے۔ حکومت بھی مطمئن ہو گئی۔ کہ پورے دو سال قیام کے بعد یک بیک آپ نے چند مخلصوں کے ساتھ خفیہ تونیر سولت کی راہ لی۔ پورب اور بنگال کے دیہاتوں میں ان کے مبلّغ موجود تھے، جو لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے اور مجاہدین کے مصارف کے لئے مال جمع کرتے اور اللہ تعالیٰ انہیں "مختصر تبرعات" میں بڑی برکت دیتا۔

وہاں پہنچنے کے بعد غالباً سال ڈیڑھ[3] سال سے زیادہ عمر نے مساعدت نہ کی۔ یہ پوری مدت جہاد کی تیاریوں میں گذری، مگر ابھی قتال و جدال کا سلسلہ شروع نہیں ہونے پایا تھا۔

---

[1] اسی سورج گڈھا کو مشہور محدث میاں صاحب سید نذیر حسین صاحبؒ دہلوی (ف ۱۳۲۰ھ) کے مرز بوم ہونے کا شرف حاصل ہے۔

[2] اس مچلکہ کی تاریخ ۲۴ر جولائی ۱۸۴۷ء سرکاری کاغذات میں ملتی ہے۔ پٹنہ کے مشہور فرم امیر خان و حشمداد خاں کے شریک حشمداد خاں اور دلاور خاں کی ذاتی ضمانت تھی جس کی پاداش میں یہ لوگ بھی بعد کو مصیبتوں کا نشانہ بنے اور ان کا فرم تباہ کر دیا گیا۔ (۷۱ - ۱۸۷۰ء) ان کے ابتلاء کا ذکر آگے آتا ہے

[3] ملاحظہ ہو: حاشیہ، صفحہ نمبر ۵۰

کہ رحمتِ الٰہی نے یاد کیا۔ سرحد کی زمین پسند آئی اور وہیں رہ گئے۔ مولانا ولایت علی کا انتقال سید صاحبؒ کی شہادت کے ۲۲ سال بعد اور ہنگامہ ۵۷ء (۱۲۷۳ھ) سے چار پانچ سال پہلے (محرم ۱۲۶۹ھ م اکتوبر ۱۸۵۲ء) میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس مہاجر و مرابط کی تربت پر اپنے انوارِ رحمت کی بارش فرمائے۔ آمین۔

مولانا عنایت علی غازیؒ

مولانا ولایت علی صاحبؒ کے بعد اُن کے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی غازیؒ مجاہدین کے امیر تسلیم کئے گئے (۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء) یوں تو یہ شروع سے آخر تک اپنے بھائی کے ساتھ اور ان کے تمام کاموں میں دست و بازو بنے رہے۔ مگر ان کا مزاج اور طبیعت کا رنگ جدا تھا۔ ان پر تیزی اور شجاعت غالب تھی۔ سید صاحبؒ سے بیعت (۱۲۳۹ھ) کے بعد، ایک منٹ کے لئے بھی کبھی آرام نہیں کیا۔ پہلے اپنے امیر و مرشد حضرت سید شہیدؒ کے احکام کے مطابق تبلیغ و جہاد میں مصروف رہے۔ امیرؒ کی شہادت کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علیؒ کے مشوروں اور ہدایت کے مطابق اعلاء کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دیتے رہے۔

تبلیغ

اپنے شیخؒ کے ساتھ یہ بھی میدانِ جہاد میں شریک تھے کہ انہیں مولانا شہیدؒ دہلوی کے مشورے سے نواحِ دہلی کی طرف ان غلط فہمیوں کے سدباب کے لئے روانہ کیا گیا، جو بعض مدعیانِ علم نے مجاہدین کے متعلق ان اطراف میں پھیلا رکھی تھیں[1]۔ اسی دوران میں بالاکوٹ کا دردناک واقعہ

---

[1] تذکرۂ صادقہ: صفحہ ۱۴۳ ؛ نیز سیرت سید احمد شہید: طبع دوم صفحہ ۱۹۲ - ۱۹۰

ایک صاحبِ علم اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ مولانا عنایت علیؒ کو نواحِ دہلی کی طرف کبھی نہیں بھیجا گیا اور ان کا دائرۂ عمل ہمیشہ بنگال ہی کا علاقہ رہا [illegible] کی نظر ثانی کے دوران میں راقم اس کی مزید تحقیق نہ کرسکا۔

پیش آیا۔ اور آپ وطن لوٹ آئے۔ جب مولانا ولایت علیؒ نے دکن سے واپس آکر جماعت کی از سرِ نو تنظیم شروع کی۔ تو آپ کو بنگال کی طرف روانہ کیا، جہاں آپ نے پہلی بار سات برس مسلسل نہایت جانفشانی اور بردباری کے ساتھ گاؤں گاؤں کا دورہ کیا اور یہ انہیں "دوروں" کا اثر تھا۔ کہ بنگال کی سرزمین تیس چالیس برس تک مجاہدینِ سرحد کے لئے آدمی اور روپے فراہم کرتی رہی۔

پہلا دورہ سات برس (یا اس سے بھی کچھ[1] زیادہ عرصہ تک) جاری رہا۔ پھر آپ سید ضامن شاہ رئیسِ کاغان کی مدد کے لئے میدانِ جہاد میں پہنچ گئے (۱۸۴۷ء) جہاں آپ ایک مدت تک راجہ گلاب سنگھ والیٔ کشمیر سے برسرِ پیکار رہے، پھر جب "بڑے حضرت" (مولانا ولایت علیؒ صاحبؒ نے خود پہنچ کر زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ تو آپ ان کی ماتحتی میں ڈیڑھ برس اور مصروفِ قتال رہے۔ یہ معرکہ آرائیاں بارآور ہو رہی تھیں کہ گلاب سنگھ اور سرکارِ انگریزی کی صلح ہو گئی۔ پھر درۂ ڈب (Doob) کے مقام پر مجاہدین کو انگریزوں کے مقابلے میں شکست ہوئی اور مولانا عنایت علیؒ، اپنے بڑے بھائی کے ساتھ پٹنہ واپسی پر مجبور ہوئے ۱۸۴۷ء جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔

مگر اس مردِ غازی کو چین کہاں؟ مولانا عنایت علیؒ کو بجا طور پر "غازی" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ سید صاحبؒ سے بیعت کے بعد (۱۲۳۹ھ) اپنے آخری لمحۂ حیات (۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) تک انہیں ایک دن بھی اہلِ دنیا کی طرح آرام کی نیند نصیب نہیں ہوئی۔ بالاکوٹ سے لوٹے، تو پھر بنگال کا رخ کیا۔ اور پھر تین چار سال تک مسلسل اس خطے میں جہاد و احیائے سنت کی تبلیغ کرتے رہے۔ یہ آپ کا دوسرا تبلیغی دورہ تھا۔ اس کے بعد جب تیسری مرتبہ سرحد کو گئے (۱۸۵۱ء) تو وہیں کے ہو رہے، جس کا تذکرہ آگے آتا ہے۔

---

[1] صاحب تذکرۂ صادقہ نے "سات برس" لکھا ہے، مگر یہ نہیں بتاتے کہ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان وہ کس مہم میں مصروف رہے۔؟

تبلیغی دوروں میں ان کا مستقر صوبہ بنگال کے ضلع جیسور (JESSORE) میں حاکم پور[1] نامی ایک گاؤں ہوتا۔ جب سفر کی صعوبتوں سے خستہ ہو جاتے تو وہیں حاجی مفید الدین صاحب کے گھر پر آرام فرماتے۔ آپ کی دوسری اہلیہ (جنہیں غائبانہ ایجاب وقبول کرا کے آپ کے پاس بھیج دیا گیا تھا) وہیں رہتیں۔ مگر یہ وقفہ بھی بے عملی کا نہ ہوتا۔ بلکہ اس اثنا میں حاکم پور اور اس کے نواح کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں آکر آپ کی صحبت اور مواعظ سے فائدہ اُٹھاتے۔

فصلِ خصومات

آپ کی تبلیغ کے سلسلے میں پنچایت اور فصلِ خصومات کا نظم خاص طور قابلِ ذکر ہے۔ طاغوتی عدالتوں سے اجتناب کوئی نئی چیز نہیں۔ اہلِ حق ہمیشہ سے "تحاکم الی الطاغوت" سے بچتے رہے ہیں۔ اور آخر قرآن مجید میں جس چیز کے انکار، اور جس سے کھلم کھلا بیزاری کا حکم دیا گیا ہے، اس سے اہلِ حق تعاون کس طرح کر سکتے ہیں؟ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ سیّد شہیدؒ کے متبعین بھی اس پر خاص زور دیتے تھے۔ اچھا ہوگا کہ آپ یہ تذکرہ خود مولانا عبدالرحیم صادق پوریؒ (مولود ۱۲۵۲ھ ف ۱۳۴۱ھ) مؤلف "تذکرۂ صادقہ" کی زبانی سُنیں:۔

لوگوں کے اصلاحِ حال اور فیصلۂ طاغوتی سے بچنے کے لئے ضرورت تھی کہ جہاں لوگوں کو فساد و فتن سے روکا جائے۔ وہاں ان میں عدل و تصفیہ کی روح بھی پھونکی جائے اور ان کے ناگزیر تنازع اور پیچیدہ مسائل کے محاکم اور فیصل کے لئے کوئی صورت قائم کر دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ شاوِرْہُم فِی الاَمر کی سنّت بھی ادا ہو سکے۔ چنانچہ جناب ہر ایک بستی میں جہاں مسجد موجود ہوتی۔ وہاں امام مقرر کرتے (اور جہاں مسجد نہ ہوتی وہاں مسجد بھی تعمیر کرا

---

[1] پٹنہ کے مجسٹریٹ ٹی۔ ای۔ راونشا کے میمورنڈم (۱۸۶۵ء) میں حاکم پور کا نام ضلع برسست (بنگال) میں آتا ہے۔

دیتے) اور فصلِ خصومات کا بار اسی کے شانہ پر رکھتے۔ چار پانچ کوس کے حلقے میں کسی بڑی مسجد کو جامع مسجد قرار دے کر ایک تعلیم یافتہ متدین امام کے سپرد کر دیتے اور امام بمنزلہ سیشن جج متصور ہوتا۔ اگر اس پر بھی لوگوں کی تسکینِ خاطر نہ ہوتی تو متخاصمین کی اپیل پر بذاتِ خود ان مقامات پر پہنچ کر فصلِ تنازع فرماتے اور ملفوظاتِ کیمیا اثر سے تالیفِ قلوب فرماتے۔[1]

جہاد

مولانا عنایت علی غازیؒ کی صحیح جگہ میدانِ جنگ تھی اور یہیں ان کے حقیقی جوہر کھلتے تھے ان کے جہاد کے چار دَور ہیں۔

۱۔ پہلا دَور سیّد صاحبؒ کی معیت میں، جب تک وہ وہاں سے ایک دوسری مہم پر نہ بھیج دیئے گئے۔

۲۔ دوسرا دور مشہدِ بالاکوٹ کے تقریباً تیرہ برس بعد شروع ہوتا ہے، جب وہ سیّد ضامن شاہ کی درخواست پر اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علیؒ کے حکم سے بالاکوٹ گئے (۱۸۴۴ء) یہ جنگ ساڑھے چار برس جاری رہی۔ یوں تو اپنے جارحانہ حملوں سے آپ نے شروع ہی میں ضامن شاہ کے قلعے، کل علاقے اور مورچے واپس دلا دیئے تھے۔ مگر گلاب سنگھ کے مکر و فریب اور مقامی ہمدردوں کی غداری[2] نے مجاہدین کو تتر بتر کر دیا اور سرکارِ انگریزی کی شرطوں کے موافق وطن لوٹنے پر مجبور ہوئے۔

مولانا ولایت علیؒ کے پہنچنے سے پہلے، مولانا عنایت علیؒ نے راجہ گلاب سنگھ

---

[1] صفحہ ۱۳۴

[2] صاحبِ "تذکرہ" صادقہ کی روایت کے مطابق۔

کو جو شکستیں دیں اور سید ضامن شاہ، رئیس کاغان کے جو مقبوضات واپس لے لئے اُن کے متعلق مولوی عبدالرحیم صاحب کا مختصر اور محتاط بیان یہ ہے۔

"بڑے بڑے معرکے سر کئے اور ظفریاب ہوئے جن سے کفّار و منافقین کے دل ہار گئے۔ سکھوں سے متعدد مورچے[1]، قلعے، علاقہ جات چھین لئے، خوانین غدّار اور سرکش بھی مطیع و فرماں بردار کر لئے۔ تمام امن و طمانیت بخش کر کلمۂ توحید کی منادی کر دی اور حدود و قصاص اسلامی جاری کر دئیے۔"

اس کی تفصیل اس قلمی رسالہ یا "اعلام نامہ" مورخہ ذی قعدہ ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء میں مذکور ہے، جو میدان جہاد سے ہندوستانی مجاہدین نے اپنے اہل ملّت و وطن کے نام ارسال کیا تھا۔

۳۔ جب مولانا ولایت علیؒ مستقل طور پر سرحد کو ہجرت کر گئے اور تقریباً ڈیڑھ برس[2] قیام

---

[1] تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۳۵۔ "مورچے" پر یہ حاشیہ بھی درج ہے۔

"تنگ چھچھ و پکھلی مع قلعہ جات ڈب۔ مظفر آباد۔ کل اٹھارہ مورچے۔"

[2] تاریخوں میں بڑا اختلاف ہے۔ مولوی عبدالرحیم صاحب (ف ۱۳۴۱ھ) نے انڈمان سے واپسی کے بعد تذکرہ صادقہ لکھی، اور اس حال میں کہ ان پر سرکار کی نظر عنایت قائم تھی بیچاروں نے بہت پھونک پھونک کر لکھا ہے۔ سرکاری رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری مرتبہ سرحد پر مولانا ولایت علیؒ صرف ایک سال زندہ رہے۔ (وہابی ٹرائل صفحہ: ۱۵۶، ۱۰) تذکرہ صادقہ میں (صفحہ ۱۳۵) "تین چار برس قیام کے بعد" وفات کا ذکر آتا ہے۔ بہر حال سنہ وفات میں اختلاف نہیں۔ راونشا کا ایک بیان یہ ہے کہ دوسری مرتبہ ۲۱ رمئی ۱۸۵۱ء (رجب ۱۲۶۷ھ) کو ولایت علیؒ سرحد پر بائے گئے (کلکتہ گزٹ: صفحہ ۱۶۱) اس طرح پر گویا ڈیڑھ سال کے بعد وفات ہوئی اور یہی قرین قیاس ہے تذکرۂ صادقہ کی روایت "تین چار برس" قیام کی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ۱۸۴۷ء میں واپسی اور ۱۸۵۲ء میں وفات متعین ہے۔ پھر تذکرۂ صادقہ میں واپسی کے بعد پٹنہ میں دو برس قیام کی بھی تصریح ہے۔ نیز یہ بھی درج ہے کہ پٹنہ سے دہلی تک کا سفر ڈیڑھ برس میں طے ہوا تھا۔ (صفحہ ۱۲۶) پھر قیام سرحد کی مدت تین چار برس کس طرح ہو سکتی ہے؟ بعض دوسرے ماخذ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مئی ۱۸۵۱ء کے لگ بھگ سرحد پر دیکھے گئے (ہنٹر: صفحہ ۱۴، حاشیہ)

کے بعد وہیں ان کا انتقال ہو گیا (ماہ محرم ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء)۔ یہ زمانہ جہاد کی تیاریوں میں گزرا۔ اور کوئی خاص جنگ نہ ہو سکی۔ مولانا عنایت علیؒ مزاج کے تیز تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کچھ ہونا چاہیئے۔ جہاندادخان والیٔ انب سے اس کی شرارت کے باعث آپ نے چھیڑ چھاڑ کرنا چاہی مگر مولانا ولایت علیؒ نے بعض مصالح کے باعث اس کو منظور نہیں کیا۔ یہ بات گرم مزاج غازیؒ کو ناگوار معلوم ہوئی اور وہ تین چار سو آدمیوں کے ساتھ، بڑے بھائی سے علیحدہ ہو کر منگل تھانہ سید عباس کے پاس جا رہے، اور ان کی املاک و فوج کی نہایت خلوص اور ہوشیاری کے ساتھ نگہداشت کی۔

۴۔ مولانا ولایت علیؒ کے انتقال کے بعد آپ منگل تھانہ سے ستھانہ (مجاہدین کا بڑا مستقر) واپس آئے اور تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعتِ امارت کی (۱۲۶۹ / ۱۸۵۲) اس وقت جنگ کے دو محاذ تھے۔ ایک ستھانہ اور دوسرا نارنجی اور منگل تھانہ۔ مولانا عنایت علیؒ پہلے نارنجی میں ٹھہرے، پھر منگل تھانہ میں۔ وہاں مجاہدین کو شکست ہوئی، تو آپ نے ستھانہ کا قصد کیا، لیکن راستہ ہی میں پیام اجل آ پہنچا۔ اس آخری دور میں جو لڑائیاں ہوئیں یا جن مصائب کا آپ کو سامنا کرنا پڑا، ان کی تفصیل آگے آتی ہے۔

یہاں صاحبِ تذکرۂ صادقہ کے ایک بیان کی توضیح بلکہ تردید مقصود ہے۔ مولانا عبدالرحیم نے سید اکبر شاہ (امیر سوات) اور ان کی اولاد (سید مبارک، سید عمر، سید عمران، سید مدار) پر بے وفائی کا الزام عائد کیا ہے، جو واقعات سے صحیح نہیں ثابت ہوتا۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ ان میں صرف سید مبارک شاہ، سید اکبر شاہ کے بیٹے تھے۔ اور سید عمر وغیرہ ان کے بھائی اور بیٹے سید مبارک شاہ، سب کے سب آخر دم تک مجاہدین کے معاون[1] و مددگار رہے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی قربانیاں برداشت کیں۔

---

[1] ہنٹر نے لکھا ہے کہ ان دنوں (۱۸۵۲ء) وہ ستھانہ "کے مجاہدین کا لیڈر رہے"؛ صلا

اس وقت خود سیدؒ اکبر شاہ زندہ تھے۔ ان کی وفات ۱۸۵۷ء، عین ہنگامہ کے دوران میں[1] ہوئی۔ ان کی موجودگی میں، ان کے بیٹے اور بھائیوں کے اختیارات ہی کیا تھے؟ جو وہ بے وفائی یا غدّاری کی جرأت کرتے۔

غدّاروں پر اعتماد

مجاہدین کے ابتلاء و مصائب کی تفصیل سے پیشتر یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ سرحد اور خوانین کی غدّاری اور بے وفائی کے باعث ان مجاہدانِ راہِ حق کو بار بار سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ خود حضرت سید شہیدؒ کو سردارانِ پشاور کی غدّاری نے جس قدر اذیت پہنچائی، وہ سب کو معلوم ہے۔ مگر یہ غدّاری اور خیانت ختم نہیں ہوئی، اور حیرت یہ ہے کہ یہ مجاہدین بھی برابر ان غدّاروں پر اعتماد کرتے رہے۔ حالانکہ مومن کی علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستانی مجاہدین سید صاحبؒ کی غیبوبت اور دوبارہ ظہور کی توقع پر ان غدّاریوں کو برداشت کرتے رہے۔ یہ سب سے بڑی غلطی تھی، جو ان "مجاہدین" نے اس سلسلے میں روا رکھی۔ بہرحال ہم اس پر آگے چل کر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ سرِدست "خوانین کی غداری" کے متعلق ایک باخبر اور "مبتلائے الم" ہستی کے تاثرات نذرِ ناظرین ہیں۔

"اس زمانے میں پنجاب و نواحِ پنجاب متعدد خوانین کے زیرِ حکومت[2] تھا۔ گویا ہر ایک

---

[1] انڈین مسلمانز: ص۱۱؛ ایک صاحبِ علم نے صحیح تاریخ وفات ۱۱ رمئی ۱۸۵۸ء بتائی ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "ساداتِ ستھانہ کی قربانیاں مجاہدینِ صادق پور سے کسی حال میں کم نہ تھیں"، واللہ اعلم بالصواب۔

[2] پنجاب کے متعلق یہ بیان صحیح نہیں۔ وہاں کبھی بھی قبائلی حکومت نہیں تھی۔ البتہ سرحدی علاقے میں بعض خوانین کا اقتدار تھا۔

تعلقدار آزاد بادشاہ تھا۔ یہ آپس میں تیغ آزمائی کرتے، حرکات شنیعہ کا بے غیرتی کے ساتھ ارتکاب کرتے۔ اخلاق و حمیت سے عریاں تھے۔ غداری، خود غرضی اور نفاق ان کا طرۂ امتیاز تھا، حلاوتِ ایمانی سے آشنا تک نہ تھے۔ اس حالتِ زبوں سے سکھوں کو انہیں ستانے کی جرأت ہوتی۔ اور ان کے آپس میں خوب بھینڑے لڑا دیتے۔ جب وہ اپنی قوت آزمائی سے عاجز آجاتے، تو حالتِ اضطراری میں برکاتِ مجاہدین یاد آجاتیں اور نہایت لجاجت کے ساتھ ایک بے نوا کی طرح اعانت و نصرت کی درخواست کرتے اور پھر اثنائے معرکہ میں یا خیر انجام پر دشمنوں کے تملق سے شرمناک بدعہدی کرتے۔"[1]

یہ تاثرات ہیں، مولوی عبدالرحیم صاحبؒ صادق پوریؒ ابن مولانا فرحت حسین صاحب (ف ۱۲۷۴ھ) کے جو اپنے دونوں چچا مولانا ولایت علیؒ اور مولانا عنایت علیؒ کی "سرگرمیوں" میں کمسنی ہی سے شریک تھے۔[2]

چھیڑ چھاڑ ۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۷ء

یہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں کہ، مولانا عنایت علیؒ کی جہادی سرگرمیوں کا چوتھا دور مولانا ولایت علیؒ کے انتقال کے بعد شروع ہوتا ہے (محرم ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء) یہ بھی پہلے گزر چکا ہے کہ وہ انگریزوں کے حلیف والیٔ امب پر حملہ کرنا چاہتے تھے، مگر مولانا ولایت علیؒ نے اجازت نہ دی۔ جب زمامِ قیادت ان کے ہاتھ میں آئی، تو ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ جہاں داد خاں، والیٔ امب سے ٹکر ناگزیر ہوگئی۔

---

[1] تذکرۂ صادقہ: ص ۱۳۶-۱۳۵

[2] مولانا عبدالرحیم صاحبؒ صادق پوری (ف ۱۳۴۱ھ) کے متعلق والد ماجد مولانا حکیم محمد عبدالشکور صاحب مدظلہٗ (مولود ۱۲۹۰ھ) ایک مرتبہ فرماتے تھے کہ ان کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان مجاہدین اور سرکارِ برطانیہ کے درمیان جو کشمکش جاری رہی، اس کا مختصر بیان درج ذیل ہے۔

"۱۸۵۲ء میں ان کا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ ستھانہ کیمپ میں، برطانی علاقے سے آدمی اور روپئے کی آمد برابر جاری تھی اور ہماری فوج سے ان کی باغیانہ خط و کتابت بھی پکڑی گئی تھی۔ ان مجاہدین نے بڑی چالاکی سے یہ چاہا تھا کہ ہماری چوتھی دیسی سپاہ، متعینہ راولپنڈی کی وفاداری داغدار ہو جائے۔"

"برطانی حکومت اب زیادہ دیر تک حقائق سے آنکھ نہیں بند کر سکتی تھی ۱۸۵۲ء کے موسم بہاری میں "ایک سرحدی جنگ" کی تجویز زیرِ غور آ چکی تھی" ——— اسی سال ان لوگوں نے ہمارے حلیف، ریاستِ انب کے سردار پر حملہ کیا، جس سے برطانی حکومت ایک فوج بھیجنے پر مجبور ہوئی۔"

"۱۸۵۳ء میں ہماری فوج کے متعدد[1] افراد "باغیوں" سے خط و کتابت کے الزام میں ماخوذ اور سزایاب ہوئے۔"

میں یہاں ان زیادتیوں، توہین اور قتل کے واقعات کی تفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا، جو ۱۸۵۸ء جنگِ سرحد کا باعث ہوئیں۔ اس پوری مدت میں (۱۸۵۷ء ——— ۱۸۵۲ء) مجاہدین نے سرحدی قبائل کو برطانوی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار رکھنے کی کوشش کی۔[2]

اس واقعے کے متعلق مجاہدین کے سب سے بڑے کرم فرما اور ہنٹر صاحب کے

---

[1] راوَنشا نے ان میں سے ایک کا نام محمد ولی، ریجمنٹ منشی، بتایا ہے۔

[2] دی انڈین مسلمانز : صہ ۱۵۔۱۴۔

پیرو مرشد جناب راونشا (Revenshaw) کلکٹر پٹنہ ۱۸۶۵ء اپنے مشہور میمورنڈم میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"۱۸۵۲ء کے رکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مذہبی دیوانوں نے ہمارے حلیف جہاں داد خاں ، والئ امب پر حملہ کیا ، جس کے باعث آگے چل کر ۱۸۵۸ء میں ضروری ہوگیا کہ سر سڈنی کاٹن کی سرکردگی میں ان کے خلاف ایک مہم بھیجی جائے۔"[1]

اس سلسلے میں ہنٹر صاحب کی مزید توضیح ملاحظہ ہو :۔

"ایک معمولی واقعے سے صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوگا۔ ۱۸۵۰ء، ۱۸۵۷ء کے درمیان ہمیں مختلف وقتوں میں سولہ مہم (Expedition) جاری کرنا پڑی، جن میں ... ۳۳ ہزار تربیت یافتہ فوج سے کام لیا گیا ـــــــــــــــ اس دوران میں ستھانہ کی نوآبادی گو سرحد کے طول و عرض میں جہاد کی روح بھڑکاتی رہی، پھر بھی ہماری فوج سے راست ٹکر نہ لے کر انہوں نے عقلمندی کا ثبوت دیا۔"[2]

آخری ابتلاء

غالباً اوپر کے بیانات سے یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ مجاہدین کے ہم خیال و ہم مشرب اصحاب بہار و بنگال میں خفیہ طور پر چندے کر کے سرحد بھیجتے تھے اور بیرونِ ہند کی امارت کی تائید کے لئے اندرونِ ہند میں بھی ان کا خاص نظام نافذ تھا جس کی ضروری تفصیل آگے آئے گی۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور سارا کام حسن و خوبی کے ساتھ چلتا رہا کہ اسی دوران میں ۱۸۶۳ء کا

---

[1] راونشا کا میمورنڈم ، مندرجہ کلکتہ گزٹ (ضمیمہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء)

[2] دی انڈین مسلمانز : صفحہ ۱۵-۱۶

پُرآشوب حادثہ پیش آیا اور گو مجاہدینؒ اور ان کے معاونین ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس قومی لڑائی میں غیر جانبدار رہے[2]، پھر بھی پٹنہ کے کمشنر مسٹر ٹیلر (W. Taylor) نے مولانا احمد اللہ صادق پوری متہم مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۶۵ء ف در انڈمان ۲۸ ذی الحجہ

---

[1] ایک صاحب علم نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ بیان اس عمومیت کے ساتھ صحیح نہیں اس لئے کہ راولپنڈی، نوشہرہ اور مردان کی فوجوں میں بغاوت کی تحریک ہوئی۔

اور مردان والی فوج کے بچے کھچے آدمی مولانا عنایت علی کے ساتھ ہو کر نارنجی اور منگل تھانہ میں لڑے۔

عاجز یہ عرض کرتا ہے کہ مجاہدین جماعتی حیثیت سے ۵۷ء کی قومی لڑائی سے الگ رہے۔ ۵۷ء کے ہنگامے کو ایک قومی جنگ سے زیادہ حیثیت نہیں دی جا سکتی اسی لئے سید صاحبؒ کے ماننے والے ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کے بعد اس سے الگ رہے۔ نوشہرہ اور مردان کے ایک آدھ دستوں میں مجاہدین کی "سرگرمیوں" کو "شرکت" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو ۵۷ء سے پہلے بھی فوجوں میں "کام" کرتے تھے، جیسا کہ ابھی اوپر ہنٹر کے حوالے سے اس قسم کی ایک "کوشش" کا ذکر آ چکا ہے، جو مجاہدین نے ۱۸۵۳ء میں راولپنڈی کے کسی دستے کے "اندر" کی تھی۔ وہابی ٹرائل ۱۸۷۱ء میں بھی عبد اللہ قواعدی نے یہ شہادت دی ہے کہ راولپنڈی کی فوجوں سے مجاہدین کا ربط قائم تھا۔ (صہ ۱۳)

[2] اسٹاڈرڈ (Stoddard) امریکی اور بعض دوسرے یورپی مؤرخ خیال کرتے ہیں۔ کہ ۵۷ء کی ہندوستان کی قومی لڑائی بھی "وہابیوں" کی دعوت کا نتیجہ تھی (حاضر العالم الاسلامی ج ۱ صہ ۲۶۳) لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ سید صاحبؒ کے متبعین اس قومی جنگ سے بالکل الگ رہے۔ ان کا اپنا الگ نظام تھا اور وہ اس کے تابع تھے۔ ۵۷ء کی قومی جنگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاست کی پیداوار تھی۔ سر جان لارنس نے بہت صحیح کہا ہے کہ اس بغاوت کی پیدائش فوج ہی سے ہوئی۔ کسی دوسری سازش کا اس میں مطلق دخل نہیں تھا۔ (صہ ۵۸۳)

(History of the Punjab)

۱۲۹۸ھ ۔وغیرہ کو بہت دق کیا (۱۸۵۷ء) مگر اس افراتفری اور ہڑبونگ میں سرحد سے مواصلات کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا اور مجاہدینِ سرحد ایسی آزمائش سے دوچار ہوئے کہ الامان و الحفیظ مولانا عبدالرحیم صادق پوری (جو مجاہدین کے لئے روپے فراہم کرنے والوں کے سرگرم شریک اور معاون تھے۔) لکھتے ہیں۔

"۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راہ پُرخطر تھی۔ شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا۔ املاک تہلکہ میں تھے۔ جانوں کو امن نہ تھا۔ پھر کس کو ہوش تھا اور کیوں کر ممکن تھا کہ سرحد کے پار فاقہ کشوں کے لئے کوئی سامان کیا جا سکتا۔ مسلسل فاقہ کشی نے حالت تباہ کر دی۔ درختوں کی کونپلوں اور پتیوں پر اصحاب صُفّہ کی سنت ادا ہونے لگی۔ چند ماہ مسلسل غلّہ پر نظر تک نہ پڑی۔ اجابتیں خون آلود ہونے لگیں۔ آپ کے پاس جو کچھ نقود تھے۔ آپ مہاجرین و انصار پر صرف کر چکے تھے۔ اور وہ تھا ہی کیا؟ اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ اب اُدھر ساتھیوں کی بدگمانیاں[1] اور طعنے شروع ہو گئے زندگی تلخ تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ اگلی امم مضطر ہو کر متیٰ نصر اللہ پکار اٹھی تھیں[2]۔"

یہی لیل و نہار تھے کہ سرکارِ انگریزی نے ۱۸۵۸ء میں پشاور سے جنرل کاٹن Cotton کی سرکردگی میں چھ ہزار فوج کے ساتھ مجاہدین پر حملہ کر دیا۔ مرے کو مارے شاہ مدار، شاید ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہو۔ مجاہدین کی اچھی خاصی تعداد مردانہ وار دادِ شجاعت دے کر شہید ہوئی۔ کچھ پہاڑوں میں چھپ گئے۔ مولانا عنایت علیؒ نے ستھانہ کا قصد کیا، مگر راستہ ہی میں چمنی (Chmnee) کے مقام پر داعیٔ اجل کو لبیک[3] کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

---

[1] مولانا عبید اللہ سندھی "اس ابتلا" اور طعن و بدگمانی کو بھی عقیدۂ غیبوبت کا شاخسانہ بتاتے ہیں۔ یہ حد درجہ زیادتی اور ان بلاکشانِ راہ حق پر ناروا اتہام ہے۔ ملاحظہ ہو۔ مولانا سندھی اور ان کے افکار پر ایک نظر ص ۸۵-۸۶

[2] تذکرۂ صادقہ: ص ۱۳۸

[3] وہابی ٹرائل: ص ۱۸، شہادتِ جیمنی، ماخوذ مقدمہ انبالہ۔ (Wahabee Trial)

صاحبِ تذکرۂ صادقہ 'وفات' کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں صہ ۱۳۸ :۔

"مگر اس صبر و استقامت کے کوہ لے نہایت حلم و رضامندی" کے ساتھ اللّٰھم بالرفیق الاعلیٰ سے زبان تر کرتے ہوئے بعارضہ بخار و "ضیق النفس" ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء کے آخر میں سجن المؤمن سے "جنت نعیم کو رحلت کی۔"

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَاحْشُرْہُ فِی زُمْرَۃِ الْمُھَاجِرِیْنَ الَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا مَعَ نَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

مختلف امراء

مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ) اور مولانا عنایت علیؒ (ف ۱۲۷۴ھ) کے بعد بیرونِ ہند کی سرگرمیوں میں مولانا ولایت علیؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ صادق پوری (مولود ۱۲۴۶ھ) کا نام زیادہ نمایاں طور پر آتا ہے، یہ کمسنی ہی سے اپنے والد ماجدؒ کے ساتھ جہاد و قتال میں مصروف رہے۔ لیکن ان بزرگوں کے علاوہ بہتیرے اور بھی ہندوستانی مہاجر تھے۔ جنھوں نے سرحدی علاقے میں جہاد کا علم بلند رکھنے کی کوشش کی۔ واقعات کی ترتیب اور تسلسل کا تقاضا ہے کہ مولانا عبداللہ کے دور کے "حادث" کی تفصیل سے پہلے ان سالکانِ راہِ نبوّت کا بھی مختصر ذکر کر دیا جائے۔

افسوس کہ ۵۸ء کے "ابتلا" کے متعلق مولوی عبدالرحیم صاحبؒ نے کوئی قابلِ ذکر بات نہیں بیان کی اور جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی اس قدر منتشر اور غیر مربوط کہ اصل "مہم" اور "معرکہ" کے متعلق معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

انگریز لکھنے والوں میں ایچ، بی، بلّو نے اس طرف اشارہ کیا ہے:۔

"مبارک شاہ (ولد سید اکبر شاہ، رئیس صوات) نے عنایت علی کے ساتھ قرآن کے قلعے پر قبضہ کرنے کا پلان تیار کیا، لیکن ان کا منصوبہ کامیاب نہ ہوا۔

تب عنایت علیؒ، نارنجی چلا آیا اور یوسف زئی قبائل کو ورغلانے کی کوشش کی۔ اس حرکت کی پاداش میں نارنجی والوں کی سرکوبی کے لیے پشاور سے جنرل کاٹن کی سرکردگی میں ایک انگریزی فوج بھیجی گئی، اور عنایت علیؒ اور اس کی پارٹی کو پہاڑیوں میں بھگا دیا گیا[1]۔"

ہنٹر نے خلافِ معمول ۱۸۵۸ء کی مہم کا بالکل سرسری تذکرہ کیا ہے:۔

"لیکن ۱۸۵۸ء میں انہوں نے کھلم کھلا ہمارے خلاف محاذ بنا لینے کی کوشش کی۔ (خاص کر یوسف زئی اور پنجتار قبائل کے ساتھ)، اور ان کی جرأت اس حد تک بڑھ گئی کہ اپنی مقررہ رقم (غالباً زکوٰۃ یا عشر) کے وصول کرنے (Collecting Their Black Mail) کے لیے انہوں نے برطانوی حکام سے مدد طلب کی۔ اور ہمارے انکار پر انتہائی دیدہ دلیری سے انہوں نے لفٹنٹ ہورن Horne اسسٹنٹ کمشنر کے کیمپ پر شب خون مارا، جو مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ اب انتقامی کاروائی میں تاخیر جائز نہیں تھی، اور سر سڈنی کاٹن (Sidney cotton) پانچ ہزار کی ایک فوج لے کر پہاڑیوں میں داخل ہوا۔"

یہ ان متعدد لڑائیوں میں سے ایک کا ذکر تھا، جو جنونی کیمپ Fonotic camp نے سرحد میں برپا کی، میں اس کا سرسری ذکر کر کے گذر جانا چاہتا ہوں ——

خلاصہ یہ کہ کچھ مشکل کے بعد ہماری سپاہ نے باغیوں کے حلیفوں کی بستیوں میں آگ لگا دی، دو اہم قلعے اڑا دیئے اور باغیوں کی تھانہ والی چھاؤنی یکسر تباہ کر دی[2]۔

مشہدِ بالاکوٹ ($\frac{۱۲۴۶ھ}{۱۸۳۱ء}$) سے لے کر مولانا ولایت علیؒ کے سرحد پہنچنے تک

---

[1] A General Report on Yusufzais

[2] ہمارے ہندوستانی مسلمان: صفحہ ۱۶

(۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء) جو باعزم اور دھن کے پکے مجاہد سرحد میں جہاد کا علم بلند کئے رہے، ان کی مفصل سرگذشت مرتب طور پر نہیں ملتی۔ اسی لئے مختلف امراء کی ترتیب اور ان کے زمانۂ امارت کی تعیین ذرا دشوار ہے۔ ایک صاحبِ علم نے ان امراء کی ترتیب اس طرح بتائی ہے۔

۱۔ شیخ ولی محمد پھلتی، ۲۔ مولوی نصیر الدین دہلوی، ۳۔ حاجی سید عبدالرحیم سورتی، ۴۔ مولانا عنایت علیؒ، پھر ان کے بعد مولانا ولایت علیؒ۔ الخ

جیمس اوکنلے (Jams Okinely) جو ۱۸۷۱ء کے مقدمۂ سازش میں سرکار کی طرف سے پیروکار تھا اور راونشا اور ہنٹر کی نسبت جماعت کے افکار و عقائد سے گہری واقفیت رکھتا ہے، (گو اس کے بیانات بھی فاش غلطیوں سے خالی نہیں) اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہے:۔

"جس وقت سید صاحب کو بالاکوٹ میں شکست ہوئی۔ مولوی قاسم ایک مہم کے سلسلے میں مظفرآباد گئے ہوئے تھے۔ شہادت سے یہ مہم ختم ہوگئی۔ اور جو سپاہی جنگ سے بھاگ گئے تھے، مولوی قاسم نے انہیں جمع کیا اور انہیں لے کر یہ ستھانہ روانہ ہوئے، انہیں کے ساتھ سید صاحبؒ کے اہلِ خاندان بھی تھے۔ یہ گاؤں سید صاحبؒ کے مخلص دوست سید اکبر شاہ کی ملکیت تھا۔ مولویوں کی شوریٰ میں فیصلہ ہوا کہ مجاہدین تختہ بند[1] (بونیر) میں قیام کریں۔ اس گاؤں میں سید اکبر شاہ کا خاندان بہت با اثر تھا۔

سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ایک لیڈر کا انتخاب ضروری تھا۔ ہندوستانی خلفاء کے ذمہ یہ کام ہوا۔ یہ لوگ دہلی میں جمع ہوئے اور

---

[1] ایک صاحبِ علم تختہ بند کی مراجعت کا واقعہ صحیح نہیں سمجھتے۔ راقم قطعی طور پر اوکنلے کے بیان کی تردید یا توثیق سے قاصر ہے۔

مولوی نصیر الدین[1] کو امیر منتخب کیا اور یہ بھی فیصلہ ہوا کہ یہ ٹونک اور سندھ ہو کر تختہ بند جائیں اور مجاہدین کے ساتھ شریک ہوں۔

نصیر الدین دہلی سے چند ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ٹونک میں مزید رنگروٹ اور روپیہ اور اسلحہ سے مدد کی گئی۔ وہاں سے یہ شکارپور (سندھ) روانہ ہوئے، جہاں انھوں نے کچھ دنوں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ سکھوں سے مقابلہ کے لئے کچھ طاقت فراہم کریں۔ ۱۸۳۲ء میں سید صاحب کے اہلِ خاندان اور فوج کے باقی لوگ آکر ملے جو تختہ بند کو بھاگ گئے تھے۔ مجاہدین اصل فوج کے ساتھ سندھ میں رہے، البتہ سید صاحبؒ کا کنبہ ٹونک واپس آگیا۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ اور سکھوں کے خطرے کے باعث امرائے سندھ اور وہابی متحد ہو گئے تھے اور سکھوں سے بچنے کے لئے امیرِ سندھ نے انہیں روک رکھا تھا۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، نصیر الدین شکارپور میں رہ گئے اور پہاڑیوں میں رہ کر جہاد کا ارادہ ترک کر دیا۔[2] رفتہ رفتہ آدمی بڑھے۔ ہندوستان سے سرمایہ اور رنگروٹ آنے لگے، لیکن مولوی نصیر الدین نے جنبش نہ کی، اور ہزارہ پر ایک معمولی حملہ کے سوا انہوں نے سکھوں سے کوئی جنگ نہ کی۔ لیکن آخر وقت آگیا۔ لارڈ اوک لینڈ نے شاہ شجاع کو زبردستی کابل کا بادشاہ بنانا چاہا۔ تب دوست محمد نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا اور وہابیوں سے شرکت کی درخواست کی۔ نصیر الدین

---

[1] نصیر الدین دو تھے۔ ایک نصیر الدین منگلوری، جو سید صاحبؒ کے ساتھ جہاد میں شریک رہے۔ واقعۂ بالاکوٹ کے وقت بھوگڑمنگ میں مقیم تھے۔ پھر شیخ ولی محمد پھلتی کی امارت میں امیرِ لشکر رہے اور یوبی میں شہید ہوئے۔

دوسرے نصیر الدین، شاہ محمد اسحاقؒ کے داماد تھے۔ جو ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ میں دہلی سے چند رفیق لے کر نکلے۔ سندھ اور بلوچستان میں مقیم رہے، پھر ستھانہ پہنچ گئے اور امیر رہے۔ وہیں وفات پائی۔ غالباً اوکنکلے نے ان ہی مولوی نصیر الدین دہلوی کا ذکر کر دیا ہے۔

[2] اوکنکلے کا یہ قیاس بالکل غلط ہے۔

مدد دینے پر مائل تھے، مگر دوسرے مولوی تیار نہیں تھے اور لوٹ آئے۔ کوئی ایک ہزار آدمی لے کر یہ کابل کی طرف بڑھے اور داور کے قریب خیمہ زن ہو کر تین سو منتخب آدمیوں کو امیر کی امداد کے لئے بھیجا۔ یہ غزنی کی حفاظت پر متعین کئے گئے۔ اور جب انگریزی فوج نے قلعہ پر حملہ کیا اور قبضہ آور ہو گئی، تو یہ لوگ بالکل تباہ ہو گئے۔ کابل پر بھی قبضہ ہو گیا اور بددل وہاں تتر بتر ہو گئے اور ہندوستان و بنگال کو لوٹ آئے۔[۱]،،

غزنی کی اس مہم میں "مجاہدین" کی شرکت کا ذکر ہنٹر نے بھی کیا ہے:۔

"گو ان کا حملہ زیادہ تر سکھ آبادیوں پر ہوتا تھا، لیکن وہ "بلے وہن" انگریز پر کسی حملے کے موقع کو بہت غنیمت خیال کرتے تھے۔ جنگِ کابل میں ہمارے دشمن کی مدد کے لئے انہوں نے ایک مضبوط فوج بھیجی اور ان کے ایک ہزار آدمی ہمارے مقابلے میں آخر دم تک ڈٹے رہے۔ صرف غزنی کی فتح میں تین سو نفوس نے برطانوی سنگینوں سے جامِ شہادت نوش کرنے کی سعادت حاصل کی۔[۲]،،

سقوطِ غزنی کے بعد مولوی نصیر الدینؒ سرحد پار پہنچ گئے۔ لیکن اوکنیلے اس باب میں خاموش ہے، وہ صرف مولوی قاسم کی واپسی کا ذکر کرتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ تمام داستان بھی سناتا ہے، جو عقیدۂ غیبوبت کے عام کرنے کے سلسلے میں مولوی قاسم کی طرف منسوب ہے۔ ہنٹر نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، بہت ممکن ہے کہ مولوی قاسم سے یہ کمزوری رُونما ہوئی ہو۔ بہر حال سرِدست ہمیں اس سے بحث نہیں۔

ذکر یہ تھا کہ مولوی نصیر الدین دہلوی سرحد پار پہنچ گئے اور یہ اور ان کے ساتھی (جن کی تعداد تین سو کے قریب ہو گی) ستھانہ رہ پڑے۔ یہ لوگ کئی سال وہیں پڑے رہے اور

---

[۱] اوکنیلے کا مقالہ (The Wahabis in India) مندرجہ کلکتہ ریویو ۱۸۷۰ء

[۲] دی انڈین مسلمانز: صہ ۱۳

غالباً ہندوستان سے امدادی رقمیں آنا شروع ہو گئی تھیں اور مولانا ولایت علیؒ امیرِ جماعت سے ان کا ربطہ (Contact) قائم ہو گیا تھا۔

ایک انگریز مصنّف کے بیان کے مطابق یہ لوگ مولوی نصیر الدین کی قیادت میں تین برس تک خاموش رہے کہ مجاہدین کے ایک قافلہ کو منارہ (Munarait) نامی گاؤں والوں نے لوٹ لیا، تو یہ لوگ حرکت میں آئے اور اس گاؤں پر ناگہانی تاخت کی اور کافی مال و اسباب چھین لائے۔ جانیں بھی تلف ہوئیں۔ اس سے یوسف زئی والے (جو مجاہدین کے ہمدرد تھے) دشمن ہو گئے اور ان غریبوں پر حملہ کر دیا۔ بیچاروں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا اور ان کی تعداد صرف ستر اسّی کے لگ بھگ رہ گئی۔ مولوی نصیر الدین شہید ہوگئے۔[1]

اس واقعے کے بعد مجاہدین مہابن کی مختلف بستیوں سے سمٹ کر پھر ستھانہ میں میر اولاد علی، سورج گڈھی، مونگیری کی قیادت میں مجتمع ہوئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سیّد ضامن شاہ رئیسِ کاغان راجہ گلاب سنگھ والیٔ کشمیر سے برسرِ پیکار تھا اور اس کی درخواست پر مولانا عنایت علیؒ صاحب غازی اور میر مقصود علی ایک جماعت کے ساتھ مہار سے تشریف لائے۔ یہ تازہ وارد جماعت

---

[1] مولوی نصیر الدین کی شہادت اور اس واقعے کا ذکر اب تک اور کسی سرکاری یا غیر سرکاری کتاب یا رپورٹ میں نظر سے نہیں گزرا۔ مقدّمات کی کارروائیوں اور دوسرے کاغذات میں مولوی نصیر الدین کا ذکر آتا ہے۔ مگر پھر وہ درمیان سے حذف ہو جاتے ہیں۔ اور میر اولاد علی سرگروہِ مجاہدین کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہو۔ کتاب ۱۸۶۴ء میں چھپی ہے اور مصنّف فوج میں ڈاکٹر تھا۔

شہادت کی صحیح تاریخ بھی نہ معلوم ہو سکی۔ مگر قرینِ قیاس یہ ہے کہ ان کی شہادت ۱۸۴۰ء سے پہلے واقع ہو چکی تھی۔ ایک "صاحبِ علم" کی روایت ہے کہ ۱۸۴۱ء کی طغیانیٔ دریائے سندھ میں ستھانہ کے ساتھ مولوی نصیر الدین صاحب کی قبر بھی بہ گئی۔

تین سو افراد پر مشتمل ہوگی۔ یہ لوگ پانچ پانچ اور چھ چھ کی مختلف ٹولیوں میں پکھلی (ضلع ہزارہ) تک پہنچے، جہاں میر اولاد علی کی مختصر جماعت بھی ستھانہ سے آکر مل گئی۔ اور مولوی عنایت علی صاحبؒ کی سرکردگی میں جدوجہد ہوتی رہی۔ مولانا ولایت علیؒ جب موقعۂ جہاد پر پہنچ گئے، تو پھر وہی امیرالجہاد بھی ہو گئے۔ (۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء)، تا آنکہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے صلح کرلی۔ مجاہدین کا قتلِ عام ہوا۔ اور ان کی پوری فوج انگریزوں کی حراست میں آگئی۔ رو ھیلے برخواست کر دئے گئے۔ مولانا ولایت علیؒ اور مولانا عنایت علیؒ حراست میں پٹنہ بھیج دئے گئے۔ لیکن مجاہدین کا ایک جتھا میر اولاد علی کی قیادت میں پھر ستھانہ پہنچ گیا۔

یہ جتھا ستھانہ میں کچھ عرصہ تک خاموش رہا، تا آنکہ مولانا ولایت علیؒ دوبارہ سرحد پہنچ گئے۔ اور میر اولاد علی نے پھر قیادت ان کے سپرد کردی۔ یہ میر اولاد علی کی قیادت کا آخری دَور تھا۔ جو تقریباً تین چار سال رہا۔ اس کے بعد مولانا ولایت علیؒ اور ان کی وفات (۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء) کے بعد ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء تک مولانا عنایت علیؒ امیرالجہاد رہے۔ غالباً میر اولاد علی کا اسی دوران میں انتقال ہو گیا (تقریباً ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء) جیسا کہ مقدمہ سازش، پٹنہ ۱۸۷۱ء کے بعض گواہوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔[1]

مولانا عنایت علیؒ (ف ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) کے بعد مولوی نوراللہ امیر ہوئے۔ ان کے دَور میں ایک آدھ جھڑپ ہوئی۔ شاہ نورلرہی[2] میں مقابلہ ہوا (۱۸۵۸ء) مجاہدین کے کمانڈر اکرام اللہ اور ان کی کافی تعداد شہید ہوئی اور انگریزی فوج نے مجاہدین کی تمام نو آبادیاں تباہ کر دیں۔

---

[1] وہابی ٹرائل: صہ ۱۰۱

[2] یہ ایک پہاڑی کا نام ہے، جو ستھانہ کے عین اوپر واقع ہے۔ یہ چھ سات ہزار فٹ بلند ہوگی، جب ستھانہ پر حملہ ہوا تو مجاہدین اُس پر چڑھ گئے تھے۔ غالباً "لرہی" ٹیلے کو کہتے ہیں۔ صحیح لفظ شاید "شاہ نور لڑی" ہو۔

ستھانہ اور منگل تھانہ کی نوآبادیاں اس طرح تباہ ہو گئیں، تو مولوی نور اللہ اور اُن کے ساتھیوں نے ستھانہ سے دس پندرہ کوس کے فاصلے پر ملکا[1] میں اپنی نوآبادی قائم کی۔ اسی دوران میں مولوی نور اللہ کا انتقال ہو گیا۔ اور میر مقصود[2] علی، جو وطن گئے ہوئے تھے، واپس آ گئے۔ (۱۸۶۰ء / ۱۲۷۶ھ) اور انہوں نے "امیر المجاہد" کی حیثیت سے از سر نو مجاہدین کی تنظیم کی۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی امارت کے بعد میر مقصود علی کا بھی انتقال ہو گیا۔ (۱۸۶۲ء / ۱۲۷۸ھ) ان کے بعد مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) کے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ صادق پوری (مولود ۱۲۴۷ھ) جو اس وقت تک گھر بار چھوڑ کر سرحد پار پہنچ چکے تھے امیر منتخب ہوئے۔

---

[1] ملکا ساداتِ ستھانہ کی ملکیت تھا، جہاں وہ ستھانہ کی بربادی کے بعد چلے گئے تھے۔ یہ ستھانہ سے ۳۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ بچے کھچے مجاہدین بھی ان کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔ مولانا عبداللہ وہیں امیر بنے تھے جنگِ امبیلا کے بعد اسے بھی برباد کر دیا گیا، جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے۔ اس کے بعد سادات منتشر ہو گئے اور مجاہدین جگہ جگہ اٹھتے بیٹھتے رہے۔

[2] میر مقصود علی دانا پور (پٹنہ) کے رہنے والے تھے اور خاندانِ صادق پور سے ان کی قرابت بھی تھی۔ ۱۸۷۱ء کے مقدمۂ سازش (پٹنہ) میں ان کے سگے بھائی الٰہی بخش کی شہادت سرکاری گواہ کی حیثیت سے درج ہے (وہابی ٹرائل صہ ۳۶ - ۳۷ - ۳۲)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۳ھ سے کئی برس پہلے مولانا ولایت علیؒ کے اہل و عیال کو لے کر وطن واپس آئے تھے۔ اور دو تین سال مشرقی ہند میں مصروفِ تبلیغ رہ کر ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے کچھ عرصہ بعد پھر لاپتہ ہو گئے۔ مختلف بیانات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۲۷۶ھ / ۱۸۶۰ء تک "مستقر" پر پہنچ گئے تھے ڈیڑھ دو سال کی مدت کے بعد ان کا انتقال ہو گیا (۱۸۶۲ء / ۱۲۷۸ھ) اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے ایک مرتبہ میرٹھ میں گرفتار بھی ہو گئے تھے۔ (صہ ۳۲)

مولانا عبداللہ صادق پوری ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء - ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء

اُوپر گزر چکا ہے کہ مولانا ولایت علیؒ فاجعہ بالاکوٹ سے چند سال پیشتر اپنے امیر و شیخؒ کے حکم سے تبلیغ و ارشاد کے لئے دکن تشریف لے گئے تھے۔ اسی دوران میں انہوں نے حیدر آباد میں ایک شریف خاتون سے شادی کر لی تھی۔ آپ کے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ وہیں پیدا ہوئے (۱۲۴۸ھ) ابتدا سے طفولیت ہی سے یہ سفر و حضر میں اپنے والد ماجدؒ کے ساتھ رہے۔ ابھی پندرہ سولہ برس کی عمر ہو گی کہ والد ماجدؒ کے ساتھ پکھلی اور بالاکوٹ میں جہاد و قتال میں عملی شرکت کی (۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) پھر دوبارہ اپنے والد کے ساتھ سوات گئے اور وہاں چار پانچ برس قیام رہا۔

اس دوران میں فوجی نظم و بندوبست انہیں کے سپرد تھا۔ مولانا عنایت علیؒ کے دورِ امارت میں (۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء ، ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء) بھی دو تین سال وہاں رہے۔ پھر چچا کی تیز مزاجی کے باعث ان سے موافقت نہ ہوئی۔ تو اپنے چھوٹے چچا مولانا فرحت حسین صاحب (ف ۱۲۷۵ھ[1]) کی طلب پر پٹنہ واپس آ گئے۔ لیکن گھر میں اس مردِ مجاہد کو قرار نہ آ سکا اور چار پانچ سال کے بعد اپنی تمام جائداد فروخت کر کے اپنے بھائی مولوی عبدالکریم (جو اس وقت نابالغ تھے) اور تمام اہل و عیال کے ساتھ مکہ معظمہ کی راہ لی۔ اور تقریباً ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں حج و زیارت سے فراغت کے بعد سوات پہنچ گئے اور کم و بیش دو سال میر مقصود علی کی ماتحتی میں کام کرتے رہے میر مقصود علی کے انتقال کے بعد تقریباً ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء جب آپ کو مجاہدین نے با تفاق امیر منتخب کیا۔ مولانا عبداللہؒ کا دورِ امارت بہت طویل اور نتیجہ خیز رہا۔ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء سے ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء تک کُل بیالیس برس یہ امیر رہے۔ اس زمانہ میں مجاہدین کو ہر قسم کے

---

[1] شوال ۱۲۷۵ھ م مئی ۱۸۵۹ء

واقعات پیش آئے، ان سے خط و کتابت اور تعاون کے جرم میں شمالی ہندوستان میں گرفتاریوں اور خانہ تلاشیوں کا بازار گرم ہوا اور سازش کے پانچ مقدمے یکے بعد دیگرے چلائے گئے (جن کی تفصیل آگے آتی ہے) سرحد پار سرکار انگریزی سے متعدد اہم معرکے پیش آئے۔ اس مختصر سی کتاب میں ان تمام واقعات کا مفصل طور پر بیان کرنا مشکل ہے۔ یہاں ہم صرف اہم واقعات کی طرف اشارہ پر اکتفا کریں گے۔

مولانا عبداللہ ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۲ء میں امیر منتخب ہوئے۔ زمام کار ہاتھ میں لیتے ہی تن دہی اور مستعدی کے ساتھ جماعت کی فوجی تربیت میں لگ گئے۔ "تیاریوں" کا اندازہ مندرجہ ذیل بیانات سے ہوگا۔

"لیکن ابھی دو برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ باغی نو آبادی نے پہاڑی آبادیوں میں خاصہ اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ ۱۸۶۱ء میں یہ ملکا سے آگے بڑھے اور ستھانہ کے ٹھیک اوپر ایک مقام پر وہ قلعہ بند ہو گئے۔"[1]

"اس کے باوجود ہماری غیر وفادار ہندوستانی رعایا باغیوں کے کیمپ میں آتی رہی اور ۱۸۶۲ء میں یہ تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ حکومتِ پنجاب دوسری سرحدی جنگ کا مشورہ دینے پر مجبور ہوئی۔ حقیقت میں صورت حال یہ ہو چکی تھی کہ وزیر ہند نے یہ خیال ظاہر کیا کہ باغیوں کو جلد یا بدیر بزورِ شمشیر نکالنا پڑے گا اور جب تک یہ ہماری سرحد پر ہیں، مستقل خطرہ کا باعث بنے رہیں گے۔"

"اس وقت تو کوئی جنگی مہم جاری کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن ہم انہیں پھر اپریل ۱۸۶۳ء میں حسبِ دستور برطانی حدود کے اندر لوٹ اور غارت گری میں مشغول پاتے ہیں۔"[2]

---

[1] انڈین مسلمانز: صد ۱۸

[2] " " : "

"اسی سال جولائی میں انہوں نے دیدہ دلیری کے ساتھ ستھانہ کی چھاؤنی پر قبضہ کر لیا۔ اور ہمارے حلیف سردار امب کو تہدید آمیز پیغام بھی بھیجے۔ آس پاس کے قبائل نے پھر مذہبی دیوانگی کے پیچھے اپنی وفاداری کی بھینٹ چڑھا دی اور ہمارے معاہدہ کا ذرہ برابر بھی خیال نہ کیا۔ باغیوں کی نوآبادی کا ایک مرتبہ پھر سرحد میں بول بالا ہوگیا۔ ۷ ستمبر ۱۸۶۳ء کو جہادیوں کی ایک جماعت برطانی علاقے پر چڑھ آئی اور ہماری رستہ دکھانے والی فوج کے کیمپ پر شبخون مار کر انہوں نے کھلی جنگ کا سگنل دے دیا۔"[1]

یہ سب ۱۸۶۳ء کی جنگِ امبیلا کی تمہید تھی۔ اصل معرکہ اور اس کے اسباب و نتائج کا تفصیلی ذکر آگے آتا ہے۔ یہاں یہ دکھانا مقصود تھا کہ مولانا عبداللہ کے امیر ہوتے ہی حالات بدلنا شروع ہوگئے تھے۔

ہنٹر کے بیانات تو بہرحال مبالغہ سے خالی نہیں۔ صورت حال کی صحیح واقفیت کے لئے ایک دوسرے واقف کار انگریز کا مندرجہ ذیل بیان کافی ہوگا۔ یہ کسی خدمت کے سلسلے میں ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ سرحدی علاقے میں موجود تھا اور اس کے بیانات بھی ایک حد تک مبالغہ اور ظن و تخمین سے خالی ہوتے ہیں۔

"یہ لوگ اس وقت مجاہدین کے لیڈر ہیں، جو صحیح تخمینہ کے مطابق بارہ سو ۱۲۰۰ چودہ سو ۱۴۰۰ کے لگ بھگ ہوں گے ——— ان کا مقصد جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں، ہندوستان میں اسلام کو از سرِ نو قائم کرنا ہے اور اپنے مستقر میں یہ لوگ سختی کے ساتھ شریعت کے پابند ہیں۔ انہوں نے فوجی تنظیم کر لی ہے اور اسلحہ سے آراستہ ہیں۔"[2]

---

[1] انڈین مسلمانز: صہ ۱۹

[2] (A General Report on Yusufsais 99-100)

معرکۂ امبیلا ۱۸۶۳ء

مجاہدین اور انگریزی سرکار کی لڑائیوں میں درۂ امبیلا کی لڑائی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ برطانوی افسروں نے بڑے طنطنے کے ساتھ چڑھائی کی تھی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ انہیں اپنی مہم میں سخت ناکامی ہوئی۔ اسی لئے ان کے مؤرخ مجاہدین کی تعداد اور سامانِ جنگ کے متعلق طرح طرح کی مبالغہ آرائیوں سے کام لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:۔

"۱۸۶۳ء کی مہم نے بڑے نقصان کے بعد ہمیں یہ سبق دیا کہ جہادیوں کی چھاؤنی کے خلاف معرکہ آرائی کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ دنیا کی بہترین جنگجو قوموں کے ۵۳ ہزار افراد سے لڑائی مول لی جائے۔"[۱]

گو ہنٹر صاحب نے اپنے بیان کی تائید میں سرکاری ریکارڈ کا حوالہ دیا ہے، پھر بھی یہ بیان حد درجہ مبالغہ آمیز ہے۔ اگر سرکار کی حریف فوج ۵۳۰۰۰ یا ۶۰۰۰۰ ہوتی، اور وہ بھی بقول ہنٹر صاحب دنیا کی بہترین جنگجو قوموں کی، تو جنرل چیمبرلین سات ہزار کی مختصر فوج لے کر حملہ کی جرأت کس طرح کرتے؟

یہ ساری داستان سرائی اس لئے کی گئی ہے کہ امبیلا کی گھاٹی پر چیمبرلین کا حملہ ناکام رہا اور وہ خود بھی بری طرح زخمی ہوا۔

"حقیقت یہ ہے کہ حملے کی اسکیم ناکام رہی۔ اصل خیال یہ تھا کہ گھاٹی کے ذریعہ ناگہانی حملہ کر کے سامنے کی وادی پر قبضہ کر لیا جائے۔ امپیریل گورنمنٹ کا حکم تھا کہ تمام فوجی نقل و حرکت ۱۵ / نومبر تک ختم ہو جائے اور یہاں ۱۴ نومبر تک ہماری فوج آگے بڑھنے سے قاصر تھی۔"[۲]

---

[۱] ہنٹر: صہ ۲۱-۲۲

[۲] ہنٹر: صہ ۲۶

"یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ باغیوں اور پناہ گزینوں کی ایک نو آبادی اندرونِ ملک کے بغاوت پسند اور مذہبی دیوانوں کی مدد کے سہارے اور تعصب و جنون کے جوش میں کھلم کھلا مقابلہ کے لئے تیار ہو جائے۔ لیکن یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی ہے کہ ایک مہذب اور اَپ ٹو ڈیٹ لشکر کے مقابلہ میں یہ لوگ خواہ کچھ دیر کے لئے بھی کس طرح جمے رہتے ہیں۔ اس کی توضیح کے لئے اُس علاقے کی جغرافی پوزیشن سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔"[1]

اب اصل معرکے کی کچھ تفصیلات ملاحظہ ہوں :-

"۱۸/ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو جنرل سر چیمبرلین (Sir Chamber Lain) کی سرکردگی میں سات ہزار برطانی سپاہ، توپ خانہ اور دوسرے سامانِ حمل و نقل سے آراستہ و پیراستہ مہم پر روانہ ہوتی ہے اور اس کرّوفر کے ساتھ کہ صرف اس فوج کے آرام و آسائش کی خاطر پورے پنجاب کا خون چوس لیا گیا تھا۔"[2]

"دوسری شام کو ایک دستہ امبیلا کی گھاٹی — — — — — — — — تک پہنچ گیا۔ ہماری پشت پر کافی سپاہ اور توپ خانے تھے۔ اور یہ "بڑی خوش نصیبی تھی کہ حملہ آور فوج کی مدد کا اتنا کافی انتظام موجود تھا۔ اس لئے کہ ۲۰ کو جنرل نے محسوس کیا کہ جن قبائل کی دوستی پر اسے اعتماد تھا، وہ ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں اور دو روز بعد اس نے حکومت کو تار دیا کہ فوج گھاٹی کو عبور کئے بغیر رُک گئی ہے۔ ۲۲ر کو قبائل نے اپنی مخالفت کا اعلان کر دیا اور چند دن بعد سوات کے مذہبی لیڈر نے بھی دشمن کے سامنے اپنی

---

[1] ہنٹر: صفحہ ۲۰ [2] ہنٹر: صفحہ ۲۲

رفاقت کا اعلان کر دیا۔ اس دوران میں سرحد سے حکومت کو تار پر تار امداد کی طلب کے موصول ہونے لگے۔ فیروز پور رجمنٹ کا ایک دستہ روانہ ہوا ایک دوسرے پیادہ دستہ نے پشاور سے پچھم کا رُخ کیا۔ سیالکوٹ اور لاہور سے بھی کمک روانہ ہوئی۔ تین ہفتوں کے اندر پنجاب کی چوکیاں سپاہ سے اس طرح خالی ہو گئیں کہ میاں میر کا کمانڈنگ افسر مشکل سے چوبیس سنگینوں کی سلامی پیش کر سکا[1]

"ادھر قبائل ہماری مختصر سی فوج کو گھیرے جا رہے تھے۔ آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ پیچھے ہٹنا شکست سے بھی بدتر ہوتا۔ ہماری اس پوزیشن سے ان لوگوں نے خوب فائدہ اٹھایا، جو پہاڑی لڑائیوں ہی کے ماحول میں پل کر جوان ہوئے ہیں[2]۔"

"ایک ایک دن کی تاخیر دشمنوں کی امیدوں اور مجنونانہ جوش میں اضافہ کر رہی تھی۔ کمک کے باوجود ہمارے جرنل کے لئے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ ہفتوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا۔"

"کہ برطانی فوج مرعوب ہو کر درہ کے اندر دبکی بیٹھی رہے اور وادی چملا (Chumla) میں بڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ اس اثنا میں باجوڑ کے قبائل کے مل جانے سے دشمن کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، اور اس طرح ہماری فوج کا ہراول، میسرہ (بایاں بازو) اور عقب کی آمد و رفت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ۸ رنومبر کو حکومتِ پنجاب نے نہایت بے صبری کے ساتھ دریافت کیا کہ اگر جرنل کو ۱۶۰۰ پیادہ فوج کی مزید کمک بھیجی جائے

---

[1] ہنٹر: صہ۲۳   [2] صہ۲۴-۲۳

تو کیا وہ ملکا کی جہادی نوآبادی کو تباہ کرنے کے لئے اقدام کر سکے گا ؟

۱۲ر نومبر کو جواب آیا کہ آگے بڑھنا اس وقت قابلِ عمل ہو سکتا ہے جب ہمارے پاس مزید دو ہزار پیادہ فوج اور کچھ توپیں ہوں۔ ساتھ ہی یہ مایوس کن پیغام بھی ملا کہ جرنل صاحب اس وقت تک ملکا پر فوج کشی کے خلاف ہیں، جب تک درمیانی قبائل سے صفائی نہ ہو جائے۔[1]

"سارے سرحدی علاقے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ۱۴ر نومبر کو حکومتِ پنجاب نے اپنی فوجی چوکیوں کو یہاں تک خالی پایا کہ وائسرائے کیمپ کے حفاظتی دستے کا ایک حصہ عاریتہً مانگنا پڑا۔ نیز سواروں اور پیادوں پر مشتمل ملٹری پولیس کی ایک جماعت، مواصلات کی حفاظت کے لئے بھیجی گئی، جو دشمنوں کی وجہ سے خطرے میں تھے ـــــــ ۱۴ر نومبر تک حالات اس قدر بگڑ گئے کہ برطانی ہندی فوج کے کمانڈرانچیف نے جلدی سے لاہور پہنچ کر لڑائی کی نگرانی اور سرپراہی اپنے ہاتھ میں لے لی۔"[2]

"حقیقت یہ ہے کہ یہ مہم ناکام ہو چکی تھی ـــــــ اور بجائے اس کے کہ کھلے میدان میں لڑائیاں ہوتیں، جن میں مہذب (؟) لڑائی کے تمام ذرائع کام میں لائے جا سکتے، ہمیں ایک بڑے پہاڑی علاقے میں مدافعانہ تدبیریں کرنی پڑیں۔ اسی روز پنجاب گورنمنٹ نے درخواست کی کہ ۱۵۰۰ آدمیوں کا ایک اور دستہ سرحد بھیج دیا جائے۔ ادھر جرنل چیمبرلین کا ۱۹ر تاریخ کو ایک تار ملا، جس سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ کمک بعد از وقت نہ ثابت ہو۔"

"۱۸ر کو دشمن نے زور و شور سے ہم پر حملہ کر دیا اور ہماری ایک چوکی پر قابض

---

[1] ہنٹر: صہ ۲۶-۲۵ [2] ہنٹر: صہ ۲۶

ہو گیا۔ افسروں کے علاوہ ہمارے کل ۱۴۴ آدمی مقتول اور مجروح ہوئے اور ہمیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ دوسرے دن غنیم نے ایک اور چوکی پر قبضہ کر لیا، جسے پھر ایک خوں ریز لڑائی کے بعد واپس لے لیا گیا۔ لیکن اس کی قیمت گراں پڑی، افسروں کے علاوہ ۱۲۸ آدمی مارے گئے یا بالکل ناکارہ ہو گئے۔"

"۱۹ر نومبر تک حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ جنرل نے تار دیا :۔

"فوجیوں کو پورا مہینہ دن رات سخت محنت کرنا پڑی ہے، تازہ دم دشمنوں کا نقصان کے سامنے مقابلہ کرنا حوصلہ شکن ہے ہمیں کمک کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے لئے دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرنا اور رسد کے لئے فوجی دستہ فراہم کرنا اور زخمیوں کو واپس بھیجنا بہت مشکل ہو گیا ہے اگر تازہ دم فوج ان دل برداشتہ اور زخم خوردہ دستوں کی جگہ لے سکے، تو ان دستوں کو میدان میں بھیج کر ان سے امدادی کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ اشد ضروری ہے۔"[1]

یہ تفصیلات ہنٹر کی کتاب سے لی گئی ہیں۔ ممکن، بلکہ بہت ممکن ہے کہ ان میں کچھ مبالغہ بھی ہو۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ملکا کی مہم میں سرکار کو بڑی ناکامی ہوئی اور برطانی فوج کا کافی نقصان ہوا۔ اس کی تائید مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری (اسیرِ انڈمان) کے ایک محتاط بیان سے بھی ہوتی ہے جو ان کی کتاب تواریخِ عجیب میں ضمنی طور پر آگیا ہے:۔

آخر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ[2] سرحد غربی (؟) ہند پر خود سرکار کی زبردستی سے ایک جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ جنرل چیمبرلین صاحب اس جنگ کے سپہ سالار تھے۔ امبیلے کی گھاٹی میں جا کر فوجِ سرکار کو بہت تکلیف ہوئی۔ مار (؟) کی مداخلت بیجا کے سبب سے اخوند سوات (صوات) بھی بغرضِ اعانت

---

[1] ہنٹر: صہ ۲۷ - ۲۶ [2] ۱۲۸۰ھ ۱۸ر جون ۱۸۶۳ء ۵ جون ۱۸۶۴ء

اہلِ قافلہ (یعنی مجاہدین) اپنے بہت سے مریدوں کو ساتھ لے کر شاملِ جنگ ہو گیا۔ ملکی افغان چاروں طرف سے اپنے بچاؤ کے واسطے مقابلۂ سرکار پر ٹوٹ پڑے۔ سخت جنگ ہونے لگا (لگی) خود جنرل چیمبرلین صاحب مجروحِ شدید ہوئے۔ قریب سات ہزار کے کشت و خون کی نوبت پہنچی تمام پنجاب کی چھاؤنیوں سے فوج کھینچ کر سرحد بھیجی گئی۔ اُدھر یہ گرما گرمی تھی۔ اِدھر لارڈ ایلجن صاحب وائسرائے ہند چینے کے پہاڑ پر اپنی اس حرکت اور زبردستی چھیڑ چھاڑ پر نادم ہو کر یک بیک مر گئے۔[۱]"

جب انگریزی فوج بلا وجہ زبردستی سے اپنی عملداری کے باہر یاغستان غیر عملداری میں چڑھائی کر کے گئے (گئی) تو سارا ملک باغستان مع اخوند سوات (صوات) کے سرکار سے بگڑ گیا اور درۂ امبیلا پر سخت لڑائیاں ہوئیں۔ اگر لاکھوں روپے رشوت دے کر ان بگڑے ہوئے افغانوں کو راضی نہ کیا جاتا، ایک آدمی بھی فوجِ انگریزی کا واپس نہ آتا۔

یہ ظاہر اور طبعی بات ہے کہ جب کوئی کسی غیر ملک میں اپنی حد سے باہر زبردستی لڑنے جاوے گا، تو اس ملک والے اپنے بچاؤ کو ضرور مقابلہ کریں گے۔ اس سبب سے اس فضول اور زبردستی کی جنگ میں سرکار کا بہت نقصان ہوا۔[۲]

لاکھوں روپیہ رشوت دے کر افغانوں کو راضی کرنے کی تفصیل خود سرکار کے ترجمان ڈاکٹر ہنٹر کی زبانی سُنئے، تو اچھا ہے۔ یہ پہلے بھی کہیں عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ ان "مجاہدینِ مرابطین" کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ بار بار دھوکا کھانے کے باوجود خوانین پر اعتماد کرتے تھے۔ جس طرح خود سید شہیدؒ اور ان کے خاص رفیقوں سے یہ چوک ہوئی کہ انہوں نے افغانی قبائل کی تربیت و اصلاح کی کوشش اور اس کے نتائج کا انتظار

---

[۱] تواریخِ عجیب: صد۳۲ [۲] تواریخِ عجیب: صد۳۳

کئے بغیر ان کے علاقے کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا، اسی طرح ان کے ماننے والوں نے یہ غلطی کی کہ پہلے خود ہندوستان کے اندر فکری و عملی انقلاب کی دعوت دینے کے بجائے سرحد پار جاکر خفیہ ذرائع سے عملی تحریک کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ ہمارے نزدیک دین کی تجدید و اقامت کے لئے ایک کھلی ہوئی عمومی دعوت، اصلاح اور فکری و اخلاقی انقلاب کی عام تحریک اور افکار و اخلاق کی تعمیرِ جدید سے کام شروع ہونا چاہیئے اور اس کے لئے صحیح مقام سرحد پار نہیں بلکہ ہندوستان کے شہر اور دیہات ہیں۔ بہر حال تحریک کی ناکامی کے اسباب پر ہم آگے چل کر پھر لکھیں گے۔ یہاں جنگِ امبیلا کے عبرتناک حشر کی داستان ملاحظہ ہو۔ خود ہنٹر صاحب راوی ہیں۔

"لیکن جو کام ہماری سپاہ سے نہ ہو سکا، وہ ہماری ڈپلومیسی نے کر دکھایا۔ سرحدی قبائل کا اتحاد ڈانواں ڈول ہوتا ہے۔ ۲۵ نومبر کو پشاور کے کمشنر نے بنیر کے بعض قبیلوں کو الگ کرلیا۔ ان کے علاوہ دو ہزار کے ایک اور دستے کو گھر جانے پر راضی کرلیا۔ نیز سوات کا سردار اپنے خاص ماننے والوں کو منتشر کرنے پر راضی کرلیا گیا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس برگشتگی کو بھانپ کر خود علیحدہ ہوگئے اور جاتے جاتے باقی ماندہ لوگوں کے درمیان بے اعتمادی کا بیج بو گئے۔ ۱۰ دسمبر تک بے اعتمادی کا رنگ کھلا۔ ۱۱ دسمبر کو قبائلِ بنیر کا بڑا جرگہ کمشنر کے ہاں آیا، لیکن شرائط نہ طے ہو سکے۔

ہم نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور ان کو جلد فیصلہ پر مجبور کرنے کے لئے ہم نے ۱۵ کو لالو (Lalu) پر شبخون مارا اور ان کے چار سو آدمی ہلاک ہوئے۔ ۱۶ کو ہم نے امبیلا بستی میں آگ لگا دی اور قبیلے کے دو سو آدمی میدان میں مجروح یا مردہ

لہ ہنٹر کی کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ مترجم نے جا بجا اصل کی عبارتیں حذف کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر اس پیرا کے آخری دو جملے اردو ترجمے سے غائب ہیں۔

چھوڑ دیئے۔"

"بس دوسرے ہی دن بونیر کے قبائل تیار ہو کر آئے اور کمشنر سے "ضروری احکام" کی درخواست کی۔ یہ علیحدگی جہادیوں کی امیدوں کے لئے پیامِ مرگ ثابت ہوئی۔ صبح شام ایک نہ ایک قبیلہ الگ ہونے لگا۔ ــــــــ سوات کی تمام فوج ہمہ دم الگ ہونے پر آمادہ تھی۔ یہ اتحاد و اتفاق کوہستانی کُہر کی طرح آن کی آن میں رخصت ہو گیا۔ بنیر کے قبائل، جن پر ان 'مجاہدین' کو اعتماد تھا۔ ہمارے ساتھ اس معاہدہ ــــــ پر متفق ہوئے۔ کہ جہادیوں کو ان کے نیستاں ــــ ہی میں جلا کر راکھ کر دیا جائے۔"

"ایک ہفتے کے اندر ایک قومی برطانی دستہ نے بنیر کی رہنمائی اور مدد کے سہارے کامل امن و امان کے ساتھ پہاڑیوں سے گذر کر ملکا کی جہادی چھاؤنی کو آلیا اور اسے خاک کر کے دم لیا یہ دستہ بدنصیب امیلا گھاٹی کے قریب ۲۳ ر دسمبر کو پہنچا اور ۲۵ ر کو پھر کھلے میدان میں تھا۔ واپسی میں ایک فائر کی بھی ضرورت نہ پڑی۔"[1]

اسی مہم امیلا کے متعلق ایک اور بیان ملاحظہ ہو۔ سید محمد لطیف، جنہیں سید شہیدؒ اور ان کی جماعت سے خاص پرخاش معلوم ہوتی ہے اپنی کتاب تاریخ پنجاب میں لکھتے ہیں۔

-"مجاہدینِ ستھانہ کے خلاف فوجی اقدام مہم امیلا کے نام سے موسوم ہے، اس کا قائد جنرل نیولی چیمبرلین تھا۔ مجاہدینِ ملکا کے آس پاس بڑی تعداد میں جمع ہوئے۔ اس پہاڑ کے شمالی جانب جو دریائے سندھ کو دریائے کابل سے جدا کرتا ہے، لڑائی دست بدست اور بہت سخت ہوئی۔ ایک معرکہ میں خود جنرل سخت زخمی ہوا ــــــ پھر کمک پہ کمک آئی۔ اور جنرل گرکاک نے انہیں لالو کے مقام پر شکست دی اور دشمن (یہ ایک مسلمان کی تحریر ہے) پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے ــــ مجاہدین کا مرکز ملکا قبضہ کے بعد نذرِ آتش کر دیا گیا، اور ...[2]"

---

[1] ہنٹر: صفحہ ۳۰-۲۹ [2] (History of the Punjab) صفحہ ۵۸۶

اس مہمِ امبیلا کے سلسلے میں ایک بات رہی جاتی ہے۔ جب یہ مہم ناکام رہی۔ اور تمام رونعدی کے باوجود مولانا عبداللہ صادق پوری کی جماعت زندہ رہ گئی۔ تو سرکارِ انگریزی نے مولانا عبدالرحیم صادق پوری (ابنِ عم مولانا عبداللہ) کے ذریعہ مصالحت چاہی۔ جو اُن دنوں (۱۸۶۴ء) مقدمۂ سازشِ انبالہ کے سلسلے میں سزایاب ہوکر انڈمان بھیجے جارہے تھے مولانا عبدالرحیم (ف ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء) اس گفتگوئے مصالحت کا ذکر ان "محتاط" لفظوں میں کرتے ہیں۔

"اس وقت ایک اور امتحان اس نالائق پر خاص کر کے کہ کمشنر صاحب و ڈپٹی کمشنر صاحب کی خواہش ہوئی کہ بذریعہ کمترین مولوی عبداللہ ساکنِ افغانستان سے پیغامِ مصالحت کیا جائے۔ کہ جن سے بہ مقامِ امبیلہ سرکار سے جنگ ہوئی تھی اور وہ اس کمترین کے چچازاد بھائی تھے..."

اس گفتگوئے مصالحت کا حشر جو کچھ ہوا ہوگا، وہ مولوی عبدالرحیم صاحب کی خاموشی سے ظاہر ہے۔

اس مہم کے بعد چار سال ایک گونہ خاموشی رہی۔ پھر ۱۸۶۷ء میں چھیڑ چھاڑ کا ذکر آتا ہے، ۱۸۶۸ء میں باضابطہ لشکر کشی کے واقعات ملتے ہیں، ہنٹر نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

"بہرحال اب کے برطانوی حکام بالکل تیار تھے۔ ۸ / ستمبر کو مرکزی حکومت نے قبائل کی سرکوبی کے لئے لشکر کشی کی اجازت دے دی۔ ۳۰ / اکتوبر کو کمانڈر انچیف کی زیرِ ہدایت اور جنرل وائلڈ سی۔ بی کی قیادت میں فوجیں روانہ ہوئیں۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے قبائل کے نام اعلان شائع کیا، جس میں بیان کیا گیا کہ کس طرح بعض ایسے قبیلے جن پر ہم نے کوئی زیادتی کی تھی اور نہ ان کے علاقے میں کوئی مداخلت کی تھی، ہماری چوکی پر حملہ کرنے کے بعد تلواروں اور جھنڈوں کے ساتھ ہمارے علاقے میں آ گھسے تھے اور ہمارے بعض دیہاتوں کو جلا دیا ہے، لہٰذا اب ان کی سرکوبی ضروری ہو گئی ہے۔

برطانوی حکومت، جسے بہت پریشان کیا جا چکا ہے، اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتی اور اب آپ لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کا جواب دیں۔ جنگ شروع ہوئی اور برطانی اقدام شروع ہوا۔ مگر سابق تجربوں کی روشنی میں دوسرے ڈھنگ پر اب کے پنجاب کی فوجی چھاؤنیاں کمزور نہیں کی گئیں، بلکہ شمالی مغربی صوبوں (موجودہ صوبجات متحدہ) سے فوجیں منگوائی گئیں۔ اصل لڑنے والا دستہ چھ سات ہزار باقاعدہ فوج پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ سرحد کی فوج تقریباً دوگنی کر دی گئی اور اس طرح پر ہندوستان کی برطانی سپاہ کا کُل سرپیہ پہاڑی جہادیوں کی سرکوبی میں لگ گیا[۳۲]۔

لیکن ان سب طنطنوں کے بعد، ہنٹر صاحب کے یہ جملے قابلِ غور ہیں:۔

"اس کے باوجود ہم اب تک بھی "خرابی" کی تہ تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بغاوت کے فوری اور راست (Direct) اسباب میں مذہب[۳۳] کا کہاں تک دخل تھا۔ لیکن پنجاب گورنمنٹ نے مہم کے نتائج کا جائزہ لیتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ مہم ختم ہو گئی اور ہم نہ تو اس قابل ہو سکے کہ ہندوستانی جہادیوں کو نکال باہر کریں اور نہ انہیں مطیع کر کے ہندوستان واپس جانے پر آمادہ کر سکے[۳۴]۔"

یہ آخری مہم ہے، جس کی تفصیل ہم تک پہنچی ہے۔ ۱۸۶۹ء کی ایک فوج کشی کے متعلق ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"ہنٹر نے ۱۸۷۱ء[۳۵] میں لکھا تھا کہ جب جنگ ہو گی ——— اور جلد یا بدیر افغانوں سے جنگ چھڑنا ضروری ہے ——— تو ہماری سرحد کی باغی نو آبادیاں دشمن کے لئے بہت کارآمد ہوں گی ——— لیکن ۱۸۷۹ء کی پوری کی پوری افغان چڑھائی میں نہ تو ستھانہ کی نو آبادی اور شنوش

---

[۳۲] ہنٹر: صہ ۳۲ (ملخص) [۳۳] اردو ترجمے میں جانے یہ جملہ کیوں حذف کر دیا گیا ہے۔

[۳۴] ہنٹر: صہ ۳۳ [۳۵] انڈین مسلمانز: صہ ۴۴ [۳۶] ہنٹر ۳۱ - ۳۲ صفحہ

پسند وہابیوں کا کہیں ذکر آیا[۱] ——— پھر ۱۸۹۰ء کی بابت ایک دوسرے صاحب ارشاد فرماتے ہیں :۔

"۱۸۹۰ء تک یہ لوگ خطرے سے خالی نہیں تھے[۲]"

بہر حال ۱۸۶۸ء کے بعد مرابطین سرحد کے حالات اب تک منضبط نہیں ہو سکے ہیں، تاریخ کے طالب علم کے لئے یہ تحقیق کا دلچسپ موضوع ہے، جہاں تک چھان بین اور ذاتی تحقیق سے معلوم ہو سکا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :۔

مولانا عبداللہؒ صادق پوری اپنی زندگی کے آخری لمحۂ حیات تک اس راہ پر ثابت قدم رہے۔ ان کی وفات شعبان ۱۳۲۰ھ نومبر ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالکریم (مولود غالباً ۱۲۵۵ھ) کو "تنظیم جماعت اور عسکری امارت" سپرد ہوئی۔ افرادِ جماعت آپ سے مطمئن تھے۔ دانشمندی اور مصلحت اندیشی سے اپنی زندگی گزاری۔ ان کا انتقال ۲۵ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ کو صوبات بنیر میں ہوا۔

اس آخر دور میں مولانا عبداللہؒ کے پوتے غازی نعمت اللہ شہیدؒ امارت پر فائز تھے اور ایک پنجابی مدعیٔ جہاد[۳] (جو اب تک مفرور ہے) کی سازش سے ایک پنجابی نوجوان نے

---

[۱] (Erehetsek) کا مقالہ۔ وہابیت کی تاریخِ عرب اور ہندوستان میں۔ مندرجہ جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ بمبئی جلد ۱۴ صہ ۳۱۸۔

[۲] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ جلد ۴ صہ ۱۰۸۹۔

[۳] نعمت اللہ شہیدؒ کی شہادت کے باب میں بڑا اختلاف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بعض تیز مزاج نوجوانوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہو گیا تھا یا پیدا کر دیا گیا تھا کہ نعمت اللہ انگریزوں سے مل گئے ہیں راقم کا اشارہ جن صاحب کی طرف ہے۔ ان کے ایک معتقد نے راقم سے اس الزام کی شکایت کی اور ان کو بری الذمہ قرار دیا۔ لیکن شہ ... کرنے کے باوجود؟؟!

پستول سے ان کا خاتمہ کر دیا۔

ان کے بعد مولانا عبداللہ کے دوسرے پوتے رحمت اللہ غازی مرابطین کے امیر ہیں۔ اس وقت یہ غالباً زندہ ہیں اور غازی نعمت اللہ کے صاحبزادے بھی جماعت میں نمایاں ہیں۔ جنہیں عام طور پر شہزادہ[1] کہا جاتا ہے اور ان دونوں کے ساتھ ماننے والوں کی ایک مختصر تعداد وہاں مقیم ہے اور یہ برائے نام امامت و امارت اب تک قائم ہے۔

"رسی جل چکی مگر بل باقی ہیں"

---

[1] اس لقب ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ "مجاہدین" کی اولاد میں وہ روح کہاں تک کارفرما ہے؟

ہندوستان کے اندر

یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ سید صاحب کی شہادت (۱۲۴۶ھ) کے بعد مولانا ولایت علیؒ نے زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لی اور پوری جماعت نے آپ کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی تجدید کی۔ (۱۲۴۷ھ)۔ شروع شروع ملک کے اندر اور باہر (یعنی جہاد بالسیف اور مال و اسباب کی فراہمی) دونوں کام مولانا ولایت علیؒ ہی کی نگرانی میں چلتے رہے۔ مگر جب وہ مستقل طور پر بیرونِ سرحد کو ہجرت کر گئے (۱۲۶۵ھ یا ۱۲۶۶ھ)، تو ان کے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین[۱] صاحب نے اندرونی نظم و تبلیغ کا کام سنبھالا۔ اور تمام کاموں میں لوگ ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ آپ کی وفات تک (۱۲۷۴ھ) اندرونِ ملک کی رہنمائی اور سربراہی یکسر آپ کے ہاتھ میں رہی۔

ان کے بعد مولانا یحییٰ علی جعفری[۲] صادق پوری نے نظم و نسق کو سنبھالا اور ایک عرصہ تک

---

[۱] مولود ۱۲۲۶ھ تفصیلی حالات کے لئے: تذکرۂ صادقہ (ص ۱۴۵ - ۱۴۱) ملاحظہ کی جائے۔

[۲] مولود تقریباً ۱۲۳۸ھ؛ ذاتی حالات کی تفصیل کے لئے تذکرۂ صادقہ (ص ۶۳ - ۷۸) کی طرف رجوع کیا جائے۔

تحریک کو حیرت انگیز طریقے پر چلاتے رہے۔ تا آنکہ ۱۸۶۴ء / ۱۲۸۰ھ میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے۔ انبالہ میں مقدمہ چلا۔ پھر انڈمان بھیجے گئے (جنوری ۱۸۶۶ء) اور وہیں ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۸ء میں انتقال ہوا۔ (ان کے حالات اور کارناموں کا مختصر بیان آگے آتا ہے)

مولانا یحییٰ علیؒ کی گرفتاری یا مقدمۂ سازش انبالہ کے بعد ان کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہؒ نے کام سنبھالا۔ تا آنکہ ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۱ھ میں ان پر بھی مستقل مقدمہ چلایا گیا۔ وہ بھی انڈمان بھیجے گئے، اور وہیں سپردِ خاک ہوئے (۲۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ، ۱۸۸۱ء)۔

مولانا احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد مولوی مبارک علی صاحب تنظیم کے ذمہ دار ہوئے۔ یہ صادق پور کے نہیں تھے۔ بلکہ اطرافِ حاجی پور ضلع مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) یا مولانا فرحت علی (ف ۱۲۷۴ھ) سے بیعت تھی۔ جماعت کی تنظیم کے سلسلے میں یہیں رہ پڑے۔ مولانا احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد جماعت کا کام ہاتھ میں لینا بڑی آزمائش کا کام تھا۔ پٹنہ کی زمین خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ ملک کے طول و عرض میں داروگیر کا سلسلہ جاری تھا۔ قسمتِ برگشتہ کی طرح سرکار کی چشمِ التفات کیا پھری، عظیم آباد کے رئیسوں اور جاہ پسندوں کے تیور بھی بدل گئے ------ ایک عجیب قیامت کا سماں تھا۔ ان حالات میں مولوی مبارک علی صاحب نے جان جوکھم میں ڈال کر تنظیمِ جماعت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک عرصے تک اپنا فرض حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے "مقدماتِ سازش" کی پیروی میں بھی انہوں نے مولوی محمد حسن صاحب ذبیح (فرزند مولانا ولایت علیؒ) کا ہاتھ بٹایا۔

جب آپ ضعیف ہوئے، تو اپنی نیابت کے لئے مولوی محمد حسن صاحبؒ کو تجویز و منتخب کیا اور ان کی تربیت میں پوری کوشش کی ------ مگر یہ تنظیم کا کام ان دنوں

لہ مولود ۱۲۲۳ھ، تفصیل کے لئے تذکرہ صادقہ (ص ۵۹-۴۴) ملاحظہ کی جائے۔

اتنا آسان نہیں تھا کہ مولوی مبارک علی صاحب سرکار کی نظرِ عنایت سے محروم رہ جاتے۔ کسی حیلے سے انہیں بھی حبس و زندان سے نوازا گیا (۱۸۶۸ء) غالباً ان کی گرفتاری ۱۸۶۸ء م ۱۲۸۵ھ کے اواخر میں ہوئی۔ اس لئے کہ مقدمۂ سازش پٹنہ (۱۸۷۱ء) کے ایک سرکاری گواہ ہریش چندر مکرجی (کلرک ڈاک خانہ پٹنہ) کا بیان ہے کہ انہوں نے ۷ر مئی اور ۲۷ر مئی ۱۸۶۸ء کو دو رجسٹرڈ خط دہلی بھیجے تھے۔ اور جس کی رسید نہ ملنے پر انہوں نے ۲۸ر نومبر کو ایک باضابطہ درخواست بھی دی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خطوط پر سنسر پیشتر سے ہو رہا تھا ——— پھر ۱۸۷۱ء کے مقدمۂ سازش میں بھی انہیں دھر گھسیٹا گیا۔ سزا تو عبور دریائے شور کی ہوئی۔ مگر انہیں قید میں اتنی تکالیف و اذیت دی گئی کہ وہیں جاں بحق ہو گئے[1]۔ مولوی مبارک علی صاحب پر یہ بھی الزام تھا کہ انہوں نے جہاد پر ایک کتاب تالیف کی تھی[2]۔

---

[1] وہابی ٹرائل: ص ۹۰

[2] سالِ وفات نہیں معلوم۔ سرکاری کاغذات سے ۱۸۶۸ء کی گرفتاری پھر ۱۸۷۱ء کے مقدمۂ سازش میں شمولیت اور سزا یابی کا ذکر آتا ہے۔ پھر کچھ پتہ نہیں ملتا۔ قید خانے کی اذیتوں اور انہیں تکالیف کے عالم میں واصل بحق ہونے کی روایت ایک نہایت معتبر بزرگ کی زبانی ہے ۱۹۳۰ء میں ان کی زیارت ہوئی تھی۔ عمر ۸۰ سال سے اوپر تھی اور ہوش و حواس بالکل بجا۔ ان سے مل کر اندازہ ہوا کہ ان کے بزرگوں کا کیا حال رہا ہوگا۔ قرائن بھی یہی ہیں کہ مولوی مبارک علی صاحب انڈمان جانے سے پہلے ہی قضا کر گئے، اس لئے کہ مولوی عبدالرحیم صاحب نے اکثر رفقائے ابتلا کا ذکر کیا ہے، اگر یہ وہاں ہوتے، تو اتنی اہم شخصیت کا تذکرہ ضرور آتا۔ مزید یہ کہ ۱۳۰۰ھ ۱۸۸۳ء میں جب اسیرانِ بلا رہا ہوئے تو اس وقت انڈمان میں صرف چھ آدمی تھے۔ جن کے نام آگے آئیں گے ان میں مولوی مبارک علی کا نام نہیں آتا۔ حالانکہ ان کے صاحبزادے نبارک علی (ماخوذ مقدمۂ سازش ۱۸۷۱ء) کا نام ان چھ میں آتا ہے۔

[3] وہابی ٹرائل: ص ۸۹

مولوی مبارک علی صاحب کی گرفتاری کے بعد مولوی محمد حسن صاحب[1] ذبیح خلف مولانا ولایت علیؒ نے کام کو سنبھالا۔ مولوی محمد حسن صاحبؒ کا حال عجیب وغریب اور سبق آموز ہے وہ ابھی بے فکری اور تنعّم کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی عمر سولہ برس سے زیادہ نہ ہوگی کہ خاندان کا ظاہری طمطراق ختم ہونے کو آیا۔ اور آخرت میں سرخروئی کا سامان تیار ہوا۔ مقدمۂ سازش انبالہ (۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء) کے سلسلے میں جب ان کے چچا زاد بھائی مولانا عبدالرحیمؒ گرفتار ہونے لگے۔ تو انہوں نے مولوی محمد حسن کو بلا کر کہا۔

"اب میں جاتا ہوں۔ لو اب گھر بار کی تم خبر گیری کرو۔"

یہ سُننا تھا کہ اس سولہ سالہ نوعمر لڑکے کا رنگ ہی بدل گیا۔ ایک طرف 'سازش' کے مقدموں کی پیروی[2] میں کلکتہ سے لے کر انبالہ تک کی دوڑ، دوسری جانب ایک بڑے کُنبے کے بچّوں، بچیوں اور عورتوں کی خبر گیری۔ ناز کے پلے ہوئے بچے اور بچیاں جن کے باپ، دادا، چچا، ماموں یا تو شہید ہو چکے تھے یا میدانِ جہاد میں تھے۔ اور باقی ماندہ اب سرکاری مہمان خانے کو بھیجے جا رہے تھے۔ جن کے گھر بار اور جائدادیں ضبط کر لی گئی تھیں بزرگوں کی قبریں تک اکھاڑ کر پھینک دی گئی تھیں۔ زمانے کی نگاہ بدل چکی تھی ——— ان جاں گسل حالات میں مولوی محمد حسن مرحوم نے وہ کر دکھایا جو بڑے بڑوں سے نہ ہوتا۔ حیرت ہوتی ہے یہ سُن کر کہ انہوں نے اس کم سنی اور بے کسی کے عالم میں لندن تک سے پیروی کے لئے بیرسٹر بلوائے اور جزائر انڈمان جا کر اسیرانِ بلا کی مزاج پُرسی بھی کی۔ مقدمات وابتلاء

---

[1] مولود ۱۲۶۴ھ؛ تفصیل کے لئے تذکرہ صادقہ: صہ ۱۵۲ - ۱۶۰

[2] مولوی محمد حسن صاحب مرحوم کی ان مُحیّر العقول کوششوں کے صلے میں پٹنہ کے کلکٹر مسٹر راونشا نے اپنے میمورنڈم میں انہیں 'بڑا بدمعاش' Agreqtrascal کے لقب سے یاد کیا ہے۔ (کلکتہ گزٹ:- ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء)۔

کا حال تو اپنی جگہ پر آئے گا۔ مولوی محمدؐ حسن مرحوم کے متعلق یہاں پر اتنا عرض کر دینا مناسب ہو
گا کہ انہوں نے خاندان کی تعلیمی پالیسی کے بدلنے اور سرسید کی طرح حکومت کی برہمی دور کرنے کی
بڑی کوشش کی۔ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء میں صوبہ کا پہلا مسلم ہائی سکول (محمڈن اینگلو عربک سکول) کے
نام سے قائم کیا، جو آج تک چل رہا ہے۔ نیز پٹنہ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نام سے صوبے کا پہلا
اُردو اخبار جاری کیا۔ اپنے دو عزیزوں کو لندن تعلیم کے لئے بھیجا۔ سرکار نے بھی ۱۸۸۹ء میں
"شمسُ العلماءؒ" کے خطاب سے ان کی کوششوں کی داد دی۔ انہیں کی روش پر مولوی محمدؐ علی
(مولود تقریباً ۱۲۶۲ھ خلف مولانا یحییٰ علی صاحب) جو جہاد میں شریک ہو چکے تھے، نے
اپنا نام امجد علی رکھ کر انگریزی پڑھی اور ایم۔ اے کیا اور دنیا میں شمسُ العلماء مولانا امجد علی
ایم۔ اے (پروفیسر گورنمنٹ میور سنٹرل کالج الہ آباد) کے نام سے متعارف ہوئے ــــــ
(ف ۱۳۲۹ھ) اسی طرح مولوی عبدالقدیر (مولود ۱۲۵۹ھ، خلف مولانا احمداللہؒ) نے
بھی میدانِ جہاد سے واپسی کے بعد اشرف علی نام بدل کر عربی علوم اور طب کی تحصیل کی۔
پھر ایم۔ اے تک نئی تعلیم حاصل کی اور مختلف مقامات میں نگاہِ خسروانہ سے پرچ پرچ کر
ملازمت کی۔ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں وفات پائی۔ پھر تو اس خاندان میں نئی تعلیم کی ایسی ریل پیل
ہوئی کہ باید و شاید ــــــــــ

شمسُ العلماء محمدؐ حسن صاحب سے اور بھی ان کی "قوم" کو توقعات تھیں، مگر وائے
افسوس کہ عین شباب کے عالم میں پیامِ اجل آگیا (۷ ربیع الاول ۱۳۰۷ھ/ ۲ نومبر ۱۸۸۹ء)
اس سلسلے میں ایک اور حقیقت کا اظہار کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے، بعض
صاحبوں کو "رازِ درونِ پردہ" کا یہ انکشاف پسند نہ آئے، مگر اب یہ حضرات "تاریخ"
بن چکے ہیں، اس لئے آنے والوں کے لئے صحیح معلومات فراہم کرنے میں تامّل نہ ہونا چاہیئے
کہنا یہ ہے کہ مولوی محمدؐ حسن صاحب کی اس تعلیمی پالیسی سے خاندان کے تمام افراد خوش نہیں
تھے۔ بعض بعض اصحاب متقشف عالم اور کٹر اہلِ حدیث بھی تھے۔ مثال کے طور پر مشہور

اہلِ حدیث عالم مولانا عبدالحکیم صادق پوری (۱۲۶۱ھ، ۱۳۳۲ھ) خلف مولانا احمد اللہؒ اسیر انڈمان) تو اتنے سخت تھے کہ انہوں نے مولوی محمد حسن صاحبؒ مرحوم کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی۔

مولوی محمد حسن صاحبؒ کی زندگی ہی میں مولانا عبدالرحیم صاحبؒ انڈمان سے واپس آچکے تھے (۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء) اس لئے خود بخود نظم و ارشاد کا کام ان کی نگرانی میں چلنے لگا۔ اور حکومت کی سخت نگرانی کے باوجود مولانا عبدالرحیمؒ (ف ۱۳۴۱ھ) کچھ نہ کچھ کرتے رہے

اب غالباً یہ سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ مولانا عبدالرحیمؒ نے اپنے آخری دورِ حیات میں، خاندان کے بعض افراد کی خاص طور پر تربیت کی تھی۔ وہ لوگ بحمداللہ زندہ ہیں اور اپنے بزرگوں کے مسلک پر قائم ہیں۔

نظامِ عمل

اندرونِ ہند کے اُمراء اور ناظمین کی فہرست ہم نے بالترتیب درج کر دی ہے رہ گئی یہ بات کہ یہ لوگ کیا کرتے تھے اور کس طرح کرتے تھے؟ سو اس کے متعلق بھی یہاں مختصر طور پر عرض کرنا ضروری ہے تاکہ تحریک کا یہ اہم حصّہ تشنۂ بیان نہ رہ جائے۔

"کیا کرتے تھے[1]؟" کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، کہ یہ اوپر بارہا گذر

---

[1] مسٹر جیمس اوکینلے نے "وہابیوں" کی سرگرمیوں اور "باغیانہ" حرکات کے سلسلے میں بنگال کے فرضی فرقہ دادو میاں، ٹیٹو میاں اور حاجی شریعت اللہ وغیرہم اور ان کے متشددانہ اور غیر متشددانہ اعمال کا تذکرہ بڑے شدّ و مد کے ساتھ کیا ہے (ملاحظہ ہو اوکینلے کا مقالہ "ہندوستان میں وہابی" مندرجہ کلکتہ ریویو۔ ۱۸۷۰ء) یہ واقعات غالباً صحیح ہوں گے، مگر ہم اب تک سیّد صاحبؒ کی جماعت سے اس کا رشتہ معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جلد ۲ صفحہ ۵۹-۵۷) میں خان بہادر مولوی ہدایت حسین مرحوم نے فرائضی پر مقالہ لکھا ہے اور غالباً بنگالی ہونے کے باعث وہ زیادہ واقف ہوں گے۔ ان کے مقالے سے بھی سیّد صاحبؒ کی جماعت سے دادو میاں اور حاجی شریعت اللہ کا تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً یہ اوکینلے صاحب کے دماغ کی اُپج ہے۔

چکا ہے۔ یہ لوگ اندرونِ ملک اور خاص کر بنگال و بہار کے اضلاع سے آدمی اور رقم فراہم کر کے بھیجا کرتے۔ جو مبلغ اور محصل آدمی اور رقم کی فراہمی کا کام کرتے، وہی ترکِ بدعات اور اتباعِ سنت کی بھی تبلیغ کرتے۔ اس طرح پر حضرت سید شہیدؒ کی تحریک کے دونوں اجزاء (جہاد اور محوِ بدعات) ساتھ ساتھ انجام پاتے تھے۔

اب رہا یہ کہ کیسے کرتے تھے؟ اس کا جواب سننے کے لئے دل و جگر چاہیئے۔ حضرت سید صاحبؒ کی شہادت ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء میں ہوئی اور پٹنہ کا آخری مقدمہ سازش ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء میں چلایا گیا۔ یہ چالیس برس کا عرصہ سید صاحبؒ کے ماننے والوں کے لئے یکسر تگ ودو اور جدوجہد کا زمانہ تھا۔ اس کی سرگذشت بہت طویل ہے۔ نہ کسی میں سننے کی تاب ہے اور نہ سنانے کی اجازت ہے۔ اور بڑی دقت یہ ہے کہ کسی مردِ مومن نے اب تک اس جماعت کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سر ولیم ولسن ہنٹر کی رسوائے عالم کتاب ہندوستانی مسلمان (The Indian Mussalmans) فرنگی مؤرخوں کا مرجع ہے اور خود اس سفید فام لال بجھکڑ کا زیادہ تر اعتماد پٹنہ کے کلکٹر مسٹر راونشا کی اس یادداشت پر ہے، جو اس نے مقدمہ سازش، پٹنہ (۱۸۶۵ء) کے سلسلے میں حکومت کے سامنے پیش کی تھی۔ یہ یادداشت ہمارے سامنے ہے اور شروع سے آخر تک طرح طرح کی مبالغہ آرائیوں اور افترا پردازیوں سے بھری ہوئی ہے۔ بہرحال جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، راقم نے صحیح معلومات اخذ کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا خلاصہ نذرِ ناظرین ہے۔

اس سلسلے میں تمہید کے طور پر ایک بات اور عرض کر دی جائے، تو شاید نامناسب نہ ہو۔ ہنٹر کی کتاب ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور سر سید مرحوم (ف ۱۸۹۸ء) نے بروقت اس کا جواب بھی لکھا تھا۔ (۱۸۷۲ء) اور ان کی کوششیں مشکور بھی ہوئیں۔ نیز نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ) نے اپنے مختلف رسالوں اور مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے اپنے رسالہ اشاعت السنۃ اور بعض تصنیفات کے ذریعہ

الزامِ "جہاد و بغاوت" کی خوب تردیدیں کیں ـــــــ لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ ہمیں مذہبی دیوانہ (Fanatic) اور غدار یا باغی (Disloyal) کے القاب پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ تو اپنی اپنی پسند ہے اور اپنی اپنی اصطلاح:۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد   جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اب ان کے کام کا مختصر خاکہ ملاحظہ ہو:۔

۱۔ ہر ہر گاؤں اور ضلع میں واعظوں کا اور اماموں کا تقرر جیسا کہ مولانا عنایت علیؒ (ف $\frac{۱۲۷۴ھ}{۱۸۵۸ء}$) کے حالات میں گزر چکا ہے۔

۲۔ چند چھوٹے مقامات کو ملا کر ایک بڑے امام یا مبلّغ کی زیرِ نگرانی کر دیا جاتا تھا۔

۳۔ ملک کے مختلف حصّوں میں دیانت دار اور خوش حال تاجروں کے پاس اس نواح کی رقم جمع ہوتی (یہ رقمیں صدقاتِ واجبہ اور عام تبرّعات، دونوں قسم کی ہوتیں) اور وہاں سے ہنڈیوں اور دوسرے ذرائع سے (کبھی کبھی خاص قاصدوں کی معرفت) پٹنہ، دہلی، تھانیسر، راولپنڈی وغیرہ تک یہ امانت پہنچائی جاتی، جہاں سے خاص ذریعوں[۱] سے منزلِ مقصود تک "ہدیے" پہنچ جاتے اس قسم کے تاجر پبنہ (بنگال) ڈھاکہ، کلکتہ، پٹنہ میں خاص

---

[۱] راونشا نے ان خاص ذرائع کی حسبِ ذیل تفصیل دی ہے۔

(i) مولا بخش (ساکن پٹنہ) محمد شفیع [متہم سازشِ انبالہ۔ بعد میں وعدہ معاف گواہ] میاں میر کیمپ، لاہور میں۔

(ii) عبدالکریم [متہم سازشِ انبالہ۔ بعد میں وعدہ معاف گواہ] شفیع کا ایجنٹ راولپنڈی میں۔

(iii) نبی بخش۔ شفیع کا ایجنٹ (راولپنڈی)

علی (ساکن جگری۔ بہار) پشاور

طور پر کام کرتے تھے۔ امیر خان، حشمداد خاں (ساکنان پٹنہ) کا چمڑے کا بہت بڑا کاروبار کلکتہ اور پٹنہ میں تھا۔ جن پر اسی پاداش میں ۱۸۷۱ء میں مستقل مقدمہ چلایا گیا اور لاکھوں روپے کا فرم تباہ کر دیا گیا۔

۴۔ تبلیغی رسالے اور جہادی نظمیں بڑی تعداد میں چھاپ کر بانٹی جاتیں۔ مثال کے طور پر مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ) کے رسالۂ دعوت، مولوی خرم علی بلہوری۔ (ف ۱۲۶۰ھ) کی مثنوی جہاد اور مولانا اولاد حسن قنوجیؒ (ف ۱۲۵۳ھ) کے رسالہ راہِ سُنّت کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ یہ تینوں بزرگ سیّد صاحبؒ کے خلفاء میں تھے، ان کے علاوہ اس سلسلے کے مختلف بزرگوں نے ترغیبِ جہاد اور ردِّ بدعات پر جتنے رسالے اور کتابیں لکھیں ان رسالوں کا مفصّل ذکر اور مضامین کی تفصیل یہاں ناممکن ہے[1]۔ مثال کے طور پر سنئے۔

(الف) مولانا اولاد حسن قنوجیؒ (ف ۱۲۵۳ھ) کے رسالہ 'راہِ سنّت'، (مطبوعہ بمبئی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) کے آخر میں منظوماتِ اردو، کا ایک ضمیمہ ہے۔ جن میں ایک منظم کا ایک مصرعہ یہ ہے۔

"خیر خواہِ کمپنی مردود ہے"

---

[1] جناب عبداللہ یوسف علی صاحب مترجمِ قرآن کریم نے اپنی کتاب (انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدّن کی تاریخ صفحہ ۸۹۔۹۰۔۱۸۹) میں اس جماعت کی ان کوششوں کا مختصر ذکر کیا ہے۔ جو اس نے اردو کی اشاعت اور ٹائپ پریس کے قیام کے سلسلے میں کیں (یعنی تبلیغ کے سلسلے میں اردو طباعت و اشاعت کی جو بیش بہا خدمات ضمنی طور پر انجام پاگئیں) آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ ہمارے مترجمِ قرآن کریم کو یہ بھی خبر نہیں کہ "بدنام وہابی" حدیثوں کو کیا درجہ دیتے ہیں؟ مولوی کرامت علی (ف ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۴ء) اور "وہابیوں" کا فرق بیان کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں۔ "اور (کرامت علی) حدیث پر یقین رکھتے ہیں، جنہیں وہابیوں نے مسترد کر دیا تھا" صہ۱۹۲) اللہ رے اسخن فہمی!!

وہابیوں نے حدیث کو مسترد کر دیا تھا؟ ہائے، رے بوالعجبی!! کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

(ب) رسالہ جہادیہ میں ایک شعر آتا ہے :-

فرض ہے تم پر مسلمانوں جہادِ کفّار ۔۔۔ اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار

(ج) ردِّ شرک کے سلسلے میں مولوی خرّم علی بلہوری رحؒ (ف ۱۲۶۰ھ) کی ایک نظم کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

خدا فرما چکا قرآن کے اندر ۔۔۔ مرے محتاج ہیں پیر و پیغمبر

نہیں میرے سوا طاقت کسی میں ۔۔۔ کہ کام آوے تمہاری بے کسی میں

جو خود محتاج ہووے دوسرے کا ۔۔۔ بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا الخ

۵۔ صادق پور کے بڑے مکان میں جو "قافلہ" کے نام سے مشہور تھا۔ جہاد کے رضا کار بنگال سے آتے ہوئے کچھ دنوں قیام کرتے اور وہاں ناظمِ جماعت کے مواعظ سے مستفید ہوتے ۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے ۔ یہ واعظ مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ) اور ان کی عدم موجودگی میں ان کے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین (ف ۱۲۷۴ھ) ہوتے اور مؤخرالذکر کے انتقال کے بعد مولانا یحیٰی علی (ف در انڈمان ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۸ء) یہ خدمت انجام دیتے۔ یہ سلسلہ باضابطہ طور پر ۱۸۶۴ء / ۱۲۸۰ھ تک جاری رہا ۔ جب کہ سازش کا پہلا مقدّمہ شروع ہوا۔ صادق پور کا "قافلہ" والا مکان (جہاں اس وقت پٹنہ سٹی میونسپلٹی کی عمارت ہے) بہت وسیع تھا۔ اور وہاں بیک وقت سینکڑوں آدمی مقیم ہوتے ۔ قافلہ کے مواعظ کے علاوہ نمو ہیہ[1] کی

---

[1] پٹنہ کا ایک محلہ۔ قدیم شہر عظیم آباد (موجودہ پٹنہ سٹی) اور موجودہ بانکی پور کے درمیان۔ آج بھی یہ مسجد ہے۔ کوئی سوا سو برس سے یہ مسجد اہلِ صادق پور کے نظم و اہتمام میں ہے اور اس پوری مدّت میں چار پانچ سے زیادہ امام نہیں ہوئے ۔ آج کل مولانا حکیم عبدالخبیر صاحب صادق پوری (خلف مولانا حکیم عبدالحکیم صاحب نبیرہ مولانا احمداللہ صاحب) ہیں مسلسل پچیس تیس سال سے خطبہ و امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

جامع مسجد میں شاہ محمد حسینؒ صاحب[1] (جنہوں نے خود اپنے صرف سے اس مسجد کی توسیع کی تھی) کا ہر ہفتہ نمازِ جمعہ کے بعد وعظ ہوتا۔ ان کے مرید اطراف واکناف سے آکر جمع ہوتے۔ زنانہ مکان میں آپ کا الگ وعظ ہوتا۔ مقدماتِ سازش کی کارروائیوں میں تمنو بیبہ کی مسجد کا ذکر کثرت سے آتا ہے اور اس سے پتہ لگتا ہے کہ بہتیرے "رضاکار" انہیں مواعظ کی حرارت سے اپنے دلوں کی انگیٹھیاں گرم کرتے۔

یہ نظمِ جماعت کا مختصر خاکہ تھا۔ جو صحیح ترین معلومات کی بنیاد پر عرض کر دیا گیا۔ غیروں کی نگاہ میں اس کی کیا وقعت تھی؟ اس کا بھی مختصر بیان ملاحظہ کر لیجئے۔ گو ان کے بیانات مبالغے سے خالی نہیں۔

سر ہربرٹ اڈوارڈس (Sir Herbert Edwards) جنہوں نے پہلے مقدمۂ سازش (انبالہ $\frac{\text{۱۸۶۴ء}}{\text{۱۲۸۰ھ}}$) کی سماعت کی تھی۔ "ان خطرناک لوگوں" کے متعلق فرماتے ہیں۔

"غداری اور بغاوت کے ایک مرکزی دفتر کا وجود پٹنہ میں بیان کیا جاتا ہے ——

—— یہ مولوی امتیاز، علم اور اپنے شہر میں اہمیت کے مالک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس خاندان کے مختلف ارکان کے متعدد وسیع مکانات بزرگوں کے مقبرے اور طالبعلموں اور مریدوں کی ضیافت کے لئے ایک "قافلہ" ہے[2]۔"

اسی طرح پٹنہ سیشن کورٹ کے جج مسٹر (W. Ainslie) جنہوں نے دوسرے مقدمۂ سازش (پٹنہ $\frac{\text{۱۸۶۵ء}}{\text{۱۲۸۱ھ}}$) کی سماعت کی تھی، فرماتے ہیں۔

---

[1] خلیفہ حضرت سید شہیدؒ؛ متوفی ۱۲۷۷ھ

[2] ٹیلر (Taylor) کی کتاب ہندوستان میں اڑتیس سال (Thirty-eight Years in India) جلد ۲ صہ ۵-۲۴۸ مطبوعہ لندن ۱۸۸۲ء

"اس طرح پر یہ ثابت ہے کہ یہ لوگ مشرقی بنگال میں جہاد کی تبلیغ کرتے۔ اور روپے اور آدمی اس کے لئے جمع کرتے تھے۔ وصول شدہ رقم پٹنہ جاتی اور "اشخاص" پٹنہ ہو کر گزرتے یہاں وہ عبدالرحیم (مولانا عبدالرحیمؒ) کے گھر میں ٹھہرتے، اور مولوی یحییٰ علیؒ (متہم سازش انبالہ ۱۸۶۴ء) انہیں بغاوت کی تلقین کرتے۔ عبدالغفور (متہم سازش انبالہ) انہیں روپے فراہم کرتا تھا۔ تھانیسر میں محمد جعفر (متہم سازشِ انبالہ ۱۸۶۴ء) ان کا استقبال کرتا تھا اور آگے سفر کے لئے زادِ راہ فراہم کرتا۔ یہ ستھانہ جاتے اور وہاں باغیوں کے ساتھ شریک ہو جاتے، جو وہاں کافی تعداد میں تھے ان کا سرغنہ احمد اللہ (مولانا احمد اللہ، متہم سازش پٹنہ ۱۸۶۵ء) تھا۔" (کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء)۔

یہ آخری فقرہ قصداً بڑھایا گیا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا یحییٰ علی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۸ء) اور مولانا عبدالرحیمؒ (ف ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء) کی گرفتاری تک (۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء) مولانا احمد اللہ (ف ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء) اس کاروبار سے بالکل الگ رہے گرفتاریوں کے بعد انہوں نے اس 'کام' کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

اس تحریک کے اصلی کارکنوں کی سیرت اور کام کے متعلق ان کے سب سے بڑے دشمن کی شہادت قابلِ غور ہے۔

"امام نے ۱۸۲۱ء میں پٹنہ کے خلفاء کا انتخاب کرتے وقت ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا، جو بے پناہ جوش و خروش کے مالک اور انتہائی مستقل مزاج تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ متعدد بار جب یہ تحریک دم توڑتی نظر آتی تھی، کس قدر انہوں نے از سرِ نو جہاد کا جھنڈا بلند کیا اور تحریک کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ پٹنہ کے خلفاء جوان تھک مبلغ، اپنی ذات سے بے فکر اور بے داغ زندگی بسر کرنے والے تھے، انگریز کافروں کی حکومت کے اکھاڑ پھینکنے میں ہمہ تن مصروف اور روپیہ اور رنگروٹ کی فراہمی کے لئے ایک مستقل نظام کرنے میں نہایت ہی ہوشیار تھے۔ اصل میں یہ اپنی جماعت کے لئے نمونہ اور

مثال تھے۔ ان کی تعلیمات کا بڑا حصہ بے عیب تھا اور یہ انہیں کا کام تھا کہ انہوں نے اپنے ہم وطنوں کی ایک بڑی تعداد کو پاک زندگی بسر کرنے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہترین تصوّر پیدا کرنے کی ترغیب[1] دی۔"

بنگال کے دیہاتوں میں مجاہدین کی تنظیم خاص طور پر قابلِ رشک تھی۔ اس سلسلے میں ہنٹر صاحب کی شہادت ملاحظہ ہو:۔

"بے شمار باغیانہ لٹریچر، پٹنہ کا مرکزی دارالاشاعت اور بنگال کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے مبلّغین کے علاوہ، باغیانہ رجحان رکھنے والے عوام تک پہنچنے کے لئے ان لوگوں نے ایک چوتھی راہ بھی نکال رکھی تھی۔ ابتداہی میں خلفاء نے اس بات کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ جہاں کہیں بھی ان کے مرید ہاتھ بنائیں، مبلّغین کو چاہیئے کہ وہاں اپنی مستقل نوآبادی قائم کر لیں اس طرح بنگال کے دیہاتی علاقوں میں متعدد باغیانہ نوآبادیاں قائم ہوگئیں۔ بغاوت کے یہ ضلع وار مرکز پٹنہ کے مرکز سے باقاعدہ خط و کتابت رکھتے تھے۔ ہر مرکز روپیہ اور آدمیوں کی فراہمی کا مکمّل نظام رکھتا[2]"

"مگر وہابی اپنی طاقت واثر کے لئے کسی ایک طبقے کے دست نگر نہیں، خواہ وہ کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو؟ وہ نہایت دلیری کے ساتھ عوام کو خطاب کرتے ہیں۔ ان کا مذہبی یا سیاسی نظام ایک انقلاب پسند آبادی کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے اور پھر بڑی خوشی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ان میں ہزاروں ایسے مخلص اور متقی آدمی ہیں، جو نفس کشی اور قربانی کو زندگی کا اوّلین فریضہ سمجھتے ہیں۔ یہی افراد اصل میں جماعت کی برتری کا باعث ہیں۔ ــــ ــــ ــــ ــــ ــــ بہترین وہابی وہ ہے، جو نہ کسی سے ڈرے

---

[1] انڈین مسلمانز صفحہ

[2] انڈین مسلمانز صفحہ

اور نہ کسی پر رحم کھائے [؟] اس کی زندگی کی شاہ راہ بالکل صاف ہے کسی قسم کا تشدد یا تنبیہ اسے اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتی[1]"

اس قسم کے ایک ممتاز کارکن کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

"۔۔۔۔۔ مالدہ کا انچارج امیر الدین عبد الرحمٰن دیہاتوں میں تحریک کی تبلیغ کرتا رہا۔ اور رضا کاروں کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں بھی مجاہدین کی امداد کے لئے سرحدی علاقوں میں جاتی رہیں۔ اسی طرح بنگال کے علاقوں میں چندہ اور رضا کاروں کی فراہمی کے لئے شاخیں قائم ہیں۔"

یہ ایک واقعہ ہے کہ ہنٹر کی مبالغہ آمیزیوں نے بنگال میں اس تحریک کو ہوا بنا دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بنگال پر جس سفید فام صاحب قلم نے کچھ لکھا، وہ اس کابوس سے متاثر رہا۔ مردم شماری کی رپورٹیں بھی اس روگ سے خالی نہیں ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۱ء کی رپورٹوں کے مقدمہ نگار نے وہابی تحریک پر اچھی خاصی بحث کی ہے اور اس کی فراہم کردہ معلومات تقریباً سب کی سب راونشا، اوکنلے اور ہنٹر (ماہرینِ وہابیات) کے بیانات سے ماخوذ ہیں بہر حال اندازہ کے لئے ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے نظامِ عمل کے متعلق ایک اقتباس پیش ہے:۔

"اس پوری مدت (۱۸۳۱ - ۱۸۶۸ء) میں پٹنہ سازش کا مرکز تھا۔ وہابی مبلغ ہندوستان اور دوسرے قریب کے ملکوں میں اپنے مشن کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ان کے بڑے لیڈر ولایت علی اور عنایت علی پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ ولایت علی نے بنگال کا دورہ کیا۔ پھر بمبئی، حیدر آباد اور صوبہ جات متوسط میں گشت کرتے رہے۔ اور انہیں علاقوں کو اپنی دعوت کا مرکز قرار دیا۔ عنایت علی نے بنگال کے اضلاع مالدہ، بوگرا، راجشاہی، پٹنہ، ندیا اور

---

[1] صفحہ ۱۰۲-۱۰۳

فرید پور میں اپنی کوششیں صرف کیں ـــــــ ولایت علی کے خلیفہ زین العابدین حیدر آبادی نے چھپرا اور سلہٹ [آسام] میں کام کیا۔ معمولی مبلغوں کا کیا ذکر، کہ ان کی تعداد بے شمار تھی۔ اس طرح پیران کے مبلغ چپہ چپہ میں پھیل گئے۔ گاہے گاہے پٹنہ سے ہدایات ملتی رہتی تھیں۔ جس سے تحریک کی عملیت میں فرق نہیں آنے پاتا۔[1]"

ان اقتباسات کا سلسلہ دراز کیا جا سکتا ہے۔ مگر ایک ہی بات کے بار بار دہرانے میں کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا۔ اُردو میں مولوی طفیل احمد صاحب نے اپنی کتاب (مسلمانوں کا روشن مستقبل) میں کچھ اقتباسات دئیے ہیں، مگر ان کا مآخذ ہنٹر کی رسوائے عالم کتاب ہے اور ہنٹر کا زیادہ تر بھروسا راونشا (T. E. Revenshaw) اور جیمس اوکنلے (James Okinely) پر ہے اور ان دونوں کی تحریروں کے نمونے دئیے جا چکے۔ امپیریل گزیٹیر (بابت ضلع پٹنہ) میں بھی ہنٹر صاحب کی رُوح کار فرما ہے۔

فرہنگِ مصطلحات

اس سلسلے کی ایک اور دلچسپ چیز کا ذکر کرنا ناظرین کی ضیافتِ طبع کا باعث ہو گا۔ مجاہدین اپنے خط و کتابت میں قسم قسم کی "سمجھی بوجھی" اصطلاحات خفیہ لغت (Code Word) کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تاکہ "کراماً کاتبین" کو شبہ نہ ہو۔ مگر ان لال بجھکڑوں نے آخر پتہ لگا ہی لیا۔ مجاہدین کے سب سے بڑے کرم فرما مسٹر راونشا نے اپنی یادداشت میں ان اصطلاحی لفظوں کی ایک فرہنگ، دی ہے جسے کچھ تفریح اور کچھ تاریخ" کی خدمت کے خیال سے ہم یہاں درج کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ البتہ اتنا ملحوظ رہے کہ ان کا حرف بہ حرف صحیح ہونا یقینی نہیں، کہ یہ لوگ مبالغہ بہت کرتے ہیں۔

---

[1] مردم شماری کی رپورٹ ۱۹۱۱ء: جلد ۵ صفحہ ۲۴۸-۲۴۶۔

جہادی، خدمت گار، بیوپاری / مسافر، سانڈ	جنگ کے رنگروٹ
قافلہ	رنگروٹوں کا جتھا
بڑا گودام	ملکا۔ستھانہ
چھوٹا گودام	پٹنہ
مقدمہ	جنگ
مختار	اللہ
سفید پتھر	ہنڈی
کتابوں کی قیمت	نقد رقمیں
قافلہ	صادق پور کے مولویوں کے مکان کا احاطہ

اور خاص کر وہ مکان جس میں مولوی ولایت علی اور عبدالرحیم رہا کرتے تھے۔

۱۸۶۵ء کے مقدمہ سازش میں عبدالغفور (متہم وسزا یافتہ مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء) جو بعد میں وعدہ معاف گواہ بن گیا تھا، اور اس کی سزا حبسِ دوام بعبور دریائے شور سے گھٹا کر دس سال کر دی گئی تھی) نے بھی اپنی "شہادت" کے سلسلے میں بعض مصطلحات کا ذکر کیا ہے۔ جو اسی کے لفظوں میں درج کئے جاتے ہیں۔

(وکیل صفائی مسٹر (Ingram) کے جرح کے جواب میں)۔

"جوتوں (Shoes) سے روپے' مراد ہیں۔ اسی طرح کتابوں سے بھی مجھے نہیں معلوم کہ کسی شہر کا بھی کوئی فرضی نام تھا۔ گلشن اس جگہ کا نام ہے۔ جہاں عبداللہ [مولانا عبداللہ امیر المجاہد] رہتے تھے۔ یحیٰی علی [مولانا یحیٰی علی، متہم سازش انبالہ] نے مجھ سے بیان کیا کہ بابو صاحب سے مراد عبداللہ ہیں۔ ــ ــ ــ ــ ــ جوتوں سے آدمی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ موقع کے لحاظ سے کتابوں سے آدمی اور روپے دونوں مراد ہوتے تھے۔ نوکروں سے مجاہدین

بھی مراد ہوتے تھے۔" [1]

راونشا کے نقشِ قدم پر ایک دوسرے ماہرِ قانون نے بھی فرہنگِ مصطلحات میں کچھ قیمتی اضافے کئے ہیں۔ ناقدری ہوگی، اگر ان کی تحقیقات سے ناظرین کو محروم رکھا جائے۔ یہ صاحب مسٹر انیسلی (W. Ainslie) پٹنہ کے سیشن جج ہیں، جنہوں نے مقدمۂ سازش، پٹنہ (۱۸۶۸ء) کی دوسری سماعت کی تھی۔ (پہلی سماعت خود مسٹر راونشا نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حیثیت سے کی تھی) یہ اپنے فیصلے کے آغاز ہی میں ترتیبِ ذیل سے جعلی، اور اصلی ناموں کی فہرست دیتا ہے اور اس نے ہر نام کے ساتھ "ثبوت" کے گواہ یا گواہوں کے نام بھی دئے ہیں، جسے ہم طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں:۔

اصلی نام	جعلی نام
یحییٰ علی	محی الدین
فیاض علی [2]	بشیر الدین
مولوی عبداللہ	بابو صاحب
مولوی عبداللہ	بابو جان ۔ میاں جان

---

[1] وہابی ٹرائل صفحہ ۶۲

[2] مولانا فیاض علی (مولود تقریباً ۱۲۳۵ھ) مولانا احمد اللہ (ف ۱۲۹۸ھ) اور مولانا یحییٰ علی (ف ۱۲۸۴ھ) کے سگے بھائی تھے، مولانا احمد اللہ سے چھوٹے اور مولانا یحییٰ علی سے بڑے، مولانا ولایت علی سے بیعت تھے اور ہمیشہ ان کے ساتھ رہے۔ پھر آخر میں صوبۂ بہار ہی کو اپنا مستقر بنا لیا۔ اور وہیں غربت و ہجرت کے عالم میں وفات پائی۔ کوشش کے باوجود ٹھیک سنہ وفات نہ معلوم ہو سکا۔ راونشا نے آپ کا نام ان لوگوں کی فہرست میں دیا ہے، جو ۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ میں مولوی عبداللہ (ف ۱۳۲۰ھ) کے ساتھ ملکا سنتھانہ کے جہادیوں میں شامل تھے۔

اصلی نام	جعلی نام
محمد شفیع	شفاعت علی
عبدالرحیم	رحیم بیگ
محمد جعفر	پیرو خاں - پیرو خلیفہ
عبدالقادر	غلام قادر
احمد اللہ	احمد علی
محمد احسان[1]	روح اللہ
عبدالرحیم کا گھر	قافلہ، قافلہ گاہ
ملکا - ستھانہ	بڑا گودام
پٹنہ	چھوٹا گودام

[1] یہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا یحییٰ علی کے صاحبزادے کا نام احسان تھا یہ غلط ہے ان کا نام محمد عیسیٰ تھا، جو بعد میں شمس العلماء مولانا امجد علی ایم اے کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان پر وارنٹ تھا، اس لئے نام بدل لیا تھا۔ یہ بھی غلط ہے کہ ان کے کوئی صاحبزادے اتیلا میں نہیں ہوئے۔

چھٹا باب

سازش کا الزام اور مقدمے

یہ پہلے کہیں گذر چکا ہے کہ کمپنی کی حکومت نے پہلے پہل "مجاہدین" کے آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہیں کی، ہنٹر ایک جگہ لکھتا ہے کہ بعض کارخانوں کے مسلمان ملازم اپنے انگریز مالکوں سے چھٹی لے کر جہاد کو جایا کرتے تھے[1] سرسید نے ایک اور دلچسپ واقعے کا ذکر کیا ہے۔

"دہلی کے ایک ہندو مہاجن نے جس کے پاس "جہادیوں" کی امدادی رقمیں جمع تھیں کچھ غبن کیا، تو مولانا شاہ محمد اسحاق نے مسٹر ولیم فریزر (William Fraesr) کمشنر دہلی کے اجلاس میں نالش کی اور مدّعی کے حق میں ڈگری ہوئی۔ وصول شدہ رقم پھر دوسرے ذریعے سے سرحد کو بھیجی گئی۔ اس مقدّمے کا اپیل صدر کورٹ الہ آباد میں ہوا،

---

[1] ہنٹر کی کتاب (ہندوستانی مسلمان) کا جواب از سرسید (صفحہ ۲۳ - ۲۲)

Sir Sayed Ahmad on Dr. Hunters) مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء

[2] انڈین مسلمانز صفحہ ۱۲

Our Indian Mussalmans

وہاں بھی عدالتِ ماتحت کا فیصلہ بحال رہا۔ ؁ٔ

شاہ محمد اسحاق صاحب؁ٔ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے۔ اس لئے یہ واقعہ قطعی طور پر ۱۸۴۲ء سے پہلے کا ہے ———— کہنا یہ ہے اور صاف کہ جب تک مجاہدین سکھوں سے اُلجھے رہے، کمپنی کی حکومت خاموش اور غیر جانبدار رہی؁ٔ "سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے" پر ترکوں نے نجد میں عمل کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو:۔ اس رسالے کا پہلا باب) ان کے اُستادوں نے اس فارمولے پر یہاں عمل کیا۔ مقصود یہ تھا کہ مجاہدین اور سکھوں کی آویزش میں سرکارِ عالی کا کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہو رہے گا۔ لیکن جونہی پنجاب کا الحاق عمل میں آیا (۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء) کمپنی اور سرکار کی نظر میں مجاہدین سے بُرا کوئی نہیں تھا۔ پھر کوئی کسر نہیں تھی، جو ان کے کچلنے کے لئے اٹھا رکھی گئی ہو۔ اس سلسلے میں حکومت نے جو تعزیری کارروائیاں کیں، ان میں مقدماتِ سازش کا نام سرِ عنوان آتا ہے۔ یہ مقدمے ۱۸۶۴ء / ۱۲۸۰ھ سے لے کر ۱۸۷۱ء / ۱۲۸۷ھ تک ملک کے مختلف حصّوں میں دائر کئے گئے۔ زیرِ نظر سطروں میں ان ہی مقدمات کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلا مقدمہ سازشِ انبالہ ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء

یہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بدنام "وہابی" مبلغ اپنا کام اس طرح انجام دیتے تھے کہ کسی

؁ٔ مولانا شاہ محمد اسحاقؒ صاحب، شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسہ تھے۔ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے تھے اور وہیں ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ و نورّ ضریحہ۔

؁ٔ موجودہ برطانوی ہند کے مشہور تاریخ داں ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، اپنے ایک خطبے میں، جو انہوں نے جون ۱۹۳۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی صد سالہ برسی کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ کہتے ہیں، کہ سرکار کمپنی کی یہ محتاط (Seruious) اور "غیر جانبدارانہ روش" اصولی طور پر (Techni- cally) بالکل درست تھی (روزنامہ لیڈر (Leader) الٰہ آباد مورخہ ۳۰ / جون ۱۹۳۹ء)

کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ مگر ۱۸۵۸ء کی فوجی مہم نے اس راز کا انکشاف کیا کہ سرحدی مقتولوں[۱]
میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد ہے، جو رنگ روپ میں پورب (بنگال و بہار) کے باشندے
معلوم ہوتے ہیں[۲]

۱۸۶۳ء / ۱۲۸۰ھ کی مہم امبیلا کے بعد سرکارِ برطانیہ کو اور کد ہوئی۔ گو اس سے پہلے بھی،
بلکہ الحاقِ پنجاب (۱۸۴۹ء / ۱۲۶۵ھ) کے بعد ہی سے حکومت کی نگاہ ان لوگوں پر تھی[۳] مگر اس
"سازش" کا حقیقی انکشاف ایک ولائتی افغان غزن خان نامی نے کیا۔ راونشا[۴] صاحب
فرماتے ہیں۔

مئی ۱۸۶۳ء کو چار بنگالی انبالہ جاتے ہوئے ضلع کرنال میں ایک سوار پولیس سرجنٹ
غزن کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ غزن خاں یوسف زئی علاقے کا باشندہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس

---

[۱] شہدا کی لاشوں کے علاوہ گھر کے بعض اہلِ عناد نے بھی مخبر رسانی کی اور اسرارِ سربستہ کے انکشاف اور تحلیل میں حصہ لیا۔ نیز شہر کے بعض رئیسوں نے بھی خیر خواہی کا حق ادا کیا۔ خاقانیِ ہند حکیم عبدالحمید عظیم آبادی (۱۲۴۵ھ - ۱۳۲۳ھ) خلف مولانا احمد اللہ نے اپنی مثنوی شہر آشوب میں "گھر کے بھیدیوں" کا ڈرڈر کر ذکر کیا ہے۔ اس کے دو شعر عرض ہیں۔

متفق گشتہ جمع از حساد ؛ دلِ شاں پر زنیفی و شر و فساد ؛ فرقہ طامعانِ اہلِ غرض ؛ زادہا اللہ فی القلوب مرض۔ الخ

[۲] انڈین مسلمانز صہ ۸۵

[۳] راونشا نے ۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) میں راولپنڈی کے ایک دستے (4th Regiment of Native Infantry) کے اندر "جہادی سازباز" کا ذکر کیا ہے۔ نیز اسی کے بیان کے مطابق اس رجمنٹ کے منشی محمد علی پر مقدمہ چلایا گیا اور وہ سزایاب ہوا (۱۲ر مئی ۱۸۵۳ء شعبان ۱۲۶۹ھ) (کلکتہ گزٹ: ۲۰ ستمبر)

[۴] کلکتہ گزٹ: ۲۰ر ستمبر ۱۸۶۵ء ہنٹر نے بھی اسی کے بیان پر اعتماد کیا ہے۔

نے چاروں بنگالیوں کو شکل و شباہت میں ان لوگوں کے مشابہ پایا، جو برطانوی فوج کے ہاتھوں ستھانہ والی لڑائی میں گرفتار ہوئے تھے۔ یہ بنگالی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کئے گئے۔ لیکن بعد میں رہا کر دیئے گئے ــ ــ ــ ــ ــ غزن خان نے اپنے بیٹے کو ملکا بھیجا اور یہ دریافت کرایا کہ پہاڑ کے جہادیوں کی اشخاص اور اسلحہ سے مدد مولوی جعفر تھانیسری کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ اطلاع انبالہ کے ضلع سپرنٹنڈنٹ پولیس کپتان پارسن (Q. D. Person) کو دی گئی۔ جنہوں نے تفتیش شروع کی۔ الخ

یہ روایت اور اس مقدمے کی اکثر تفصیلات راونشا اور اس کے شاگرد رشید ہنٹر نے تقریباً ٹھیک ٹھیک بیان کی ہیں۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری نے اپنی کتاب تواریخِ عجیب میں اس مقدمے کی پوری روداد قلم بند کر دی ہے، جو اپنے بیان کی سادگی اور پُرکاری کے لحاظ سے پڑھنے کے قابل ہے۔ یہاں سازش کے انکشاف سے متعلق مولوی محمد جعفر صاحب کی تحریر بھی ملاحظہ کر لی جائے، تاکہ سرکاری "ماہرینِ فن" اور ایک مبتلائے محن کے بیانات کا مقابلہ کر کے "بین السطور" مفہوم اخذ کیا جا سکے۔

"ــ ــ ــ ــ ــ ایسے نازک وقت اور گھما گھمی کے ایام میں [یعنی امبیلا کی مہم میں سرکاری فوج کی تباہی کے دنوں میں] ۱۱ دسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۲۸ جمادی الثانیہ ۱۲۸۰ھ ہجری کو ایک سوار پولیس متعینہ چوکی پانی پت ضلع کرنال مسمی غزن خان نام ایک ولائتی افغان نے کسی ذریعہ سے میرے حال سے واقف ہو کر اور ایسے وقت میں اپنی دنیوی بھلائی کا موقع جان کر ایک بڑی لمبی چوڑی کیفیت خیر خواہانہ [؟] کے ساتھ بحضور صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہو کر یہ مخبری کی کہ یہ جنگ جو ہندوستانی "قافلہ" [فافہم] والوں کے ساتھ سرحد پر ہو رہا ہے [کذا] ان لوگوں کو محمد جعفر نمبردار تھانیسر روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے۔ خیر ڈپٹی کمشنر کرنال نے یہ داستان سن کر بذریعہ تار برقی ضلع انبالہ کو کہ جس کی حدود اراضی کے اندر ہمارا شہر واقع ہے۔ خبر بھیج دی ص۳

جب داستان چھڑ گئی ہے۔ تو اس روداد الم کا ایک دلچسپ باب اور ملاحظہ کر لیجئے

"اِدھر مُخبر مُخبِری کر کے نکلا تھا کہ اُدھر ہمارے ایک دوست ڈپٹی کمشنر صاحب کرنال کی ملاقات کو ان کے بنگلے پر پہنچے۔ جن سے عِندَالتذکرہ صاحبِ موصوف نے ذکر اس مُخبری کا بھی کیا۔ جب بعد انفراغ ملاقات یہ صاحب اپنے ڈیرے کو تشریف لائے تو انہوں نے مُسمّٰی کاکا نام ایک اپنے نوکر سے جو میرا ہمسایہ تھا، بطورِ افسوس حال اس مُخبری کا بیان کیا۔ کاکا مذکور یہ حال سن کر اسی وقت اس کی خبر کرنے کو تھانیسر دوڑ پڑا۔ لیکن خوبیٔ تقدیر سے کچھ زیادہ رات گئے یہ شخص تھانیسر میں پہنچا اور سب سے پہلے میرے مکان پر آیا۔ مگر میں اس وقت گھر کے اندر سو رہا تھا۔ اس نے وقت رات کو ہمارا دروازہ بند اور ہم کو سوتے دیکھ کر ایسے آرام کے وقت ہم کو تکلیف دینا مناسب نہ جان کر اپنے دل میں سوچا کہ فجر کو خبر دوں گا۔ اِدھر تقدیر اس کو تو دروازے پر سے ہٹا لے گئی۔ اب اُدھر انبالہ کی کیفیت سنیئے، جب انبالہ میں یہ تار خبر پہنچی تو ایک وارنٹ میری خانہ تلاشی کا جاری ہوا اور کپتان پارسن صاحب ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک جماعتِ کثیر پولیس کی لے کر راتوں رات میرے مکان پر[1] پہنچے"۔ ۔ ۔ (ص۳۰۴)

پھر کیا ہوا؟ اس کی تفصیلی سرگذشت تواریخِ عجیب سے معلوم ہوگی۔ ہنٹر نے بھی اپنی کتاب میں اس مقدمے کی تفصیلات دی ہیں۔ اس لئے ہم یہاں دورانِ مقدمہ کی تفصیلی کارروائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ضروری باتیں ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:۔

اس مقدمہ میں کل گیارہ ملزم[2] تھے، جن کے نام درج ذیل ہیں۔

---

[1] پارسن نے اپنی شہادت میں خانہ تلاشی کی تاریخ ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء بتائی ہے۔ (وہابی ٹرائل ص۲۵)

[2] گرفتاری تو بہتوں کی ہوئی۔ مگر ملزم صرف گیارہ آدمی قرار دیئے گئے، کچھ لے دے کر چھوڑ دیئے گئے اور بعضوں نے سرکاری گواہ بن کر رستگاری حاصل کی۔

۱۔ مولانا یحیٰی علی جعفری صادق پوری۔ عمر ۴۲ سال۔

راونشا نے ان کا عہدہ امیر الواعظین بتایا ہے۔ اصل میں یہ نظمِ جماعت کے ذمہ دار تھے۔ انہیں "سرغنہ" کے لقب سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ اور بجا طور پر۔

۲۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری۔ عمر ۲۸ سال تقریباً سولہ سال جزائر انڈمان میں رہ کر ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں رہا ہوئے اور بڑی عمر پاکر ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔

۳۔ منشی محمد جعفر تھانیسری۔ عمر ۲۸ سال، ساکن تھانیسر ضلع انبالہ تمام اسیرانِ بلا میں یہ سب سے زیادہ ہوشیار اور معاملہ فہم تھے۔ پورے مقدمے کے دوران میں انہوں نے کوئی وکیل نہیں مقرر کیا۔ اور بڑی قابلیت کے ساتھ گواہوں پر جرح کی۔ مولوی عبدالرحیم کے ساتھ یہ بھی رہا ہوئے اور ایک عرصہ آزاد رہ کر ۱۹۰۵ء میں رحلت کی

سیّد صاحب کے ماننے والوں کی جماعت میں بھی ایک ذمہ دار آدمی ایسے ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کی تھی۔

۴۔ میاں عبدالغفار۔ ساکن (پٹنہ)۔ راونشا نے ان کا نام "عبدالغفور ولد منگو قوم کوشری عمر ۲۵ سال۔ ملازم ملزم نمبر ۸" [یعنی مولانا عبدالرحیم] لکھا ہے۔ وہ کیا جانے کہ رؤسائے صادق پور اس "ملازم" کا "آقا" سے بڑھ کر احترام کرتے تھے یہ بزرگ اُمّی محض تھے۔ مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ) کے خادم تھے۔ مولانا فرحت حسینؒ (ف ۱۲۷۰ھ) اور مولانا یحیٰی علیؒ (ف ۱۲۸۴ھ) سے تربیت حاصل کی۔ مولوی عبدالرحیم صاحبؒ کے ساتھ انڈمان سے واپس ہوئے۔ کوئی تیس برس ہوئے کہ ان کا انتقال ہوا۔ خود مولانا عبدالرحیم اور تمام متاخرین علمائے صادق پور انہیں سیدی میاں عبدالغفار کہا کرتے۔ صحیح تاریخ وفات نہ معلوم ہو سکی (ف تقریباً ۱۳۲۲ھ)

ے یہ بھی ہنٹر کا بیان ہے۔ اور دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

۵۔ قاضی میاں جان۔ ساکن کمرکلی (Commercolly) ضلع پٹنہ (بنگال) عمر ۶۰ سال انبالہ جیل ہی میں وفات پائی۔ انبالہ کے جج کے بیان کے مطابق مراسلات کا سب سے زیادہ باغیانہ حصہ انہیں کے گھر پر پایا گیا۔[1] شہادتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ متعدد ناموں سے مشہور تھے۔ ان کے بھائی قاضی مراد علی نے ان کے خلاف شہادت دی۔ اسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جائیداد ضبط کر لی گئی تھی اور قاضی مراد کو شہادت کے معاوضے میں انعام بھی ملا تھا۔[2]

یہ پانچ بزرگ تمام ابتلا و آزمائش میں ثابت قدم رہے اور اپنی ثابت قدمی سے عہدِ صحابہ کی یاد تازہ کر دی (اسیرانِ ابتلا کے آلام و مصائب کا ذکر آخر میں آئے گا۔)

۶۔ محمد شفیع انبالوی۔ یہ پیشے کے اعتبار سے قصاب تھا اور فوجی چھاؤنیوں میں گوشت "سپلائی" کیا کرتا تھا۔ اور لاکھوں روپے کے کاروبار کا مالک تھا۔[3] اس کا مرکز راولپنڈی تھا، اور مختلف چھاؤنیوں میں اس کے گماشتے مقرر تھے اور تھانہ کی جہادی چھاؤنی کو روپے زیادہ تر اسی کے ذریعہ جاتے تھے۔

اسی لئے پہلے پہل مولانا یحییٰ علیؒ اور منشی محمد جعفرؒ صاحب کے ساتھ اسے بھی پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ بعد میں ان تینوں کی سزا بھی پنجاب جوڈیشل کمشنر نے

---

[1] ہنٹر: صفحہ ۹۷ - ۸۹

[2] وہابی ٹرائل: صہ ۲۶

[3] ایک صاحب لکھتے ہیں کہ اس کا خاندان وارن ہیسٹنگز (۱۷۸۵ - ۱۷۷۲) کے زمانے سے گورنمنٹ چھاؤنیوں کی ٹھیکہ داری کرتا تھا۔ (جنرل بمبئی رائل ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۱۴ صہ ۳۷۲)

"حبسِ دوام بعبور دریائے شور" سے بدل دی (۲۴ راگست ۱۸۶۴ء) لیکن اوّل دن ہی سے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بعد میں دوسروں کے ساتھ یہ بھی وعدہ معاف گواہ بن گیا تھا۔ ۱۸۶۵ء کے مقدمۂ سازش، پٹنہ اور ۱۸۷۱ء کے آخری مقدمۂ سازش (پٹنہ) میں اس نے سرکاری گواہ کی حیثیت سے شہادت دی ——— کُل دو برس یہ قید رہا۔ لیکن سرکار نے اس کی جائیداد ضبط ہی کر لی اور واپس نہ کی۔ مولوی محمد جعفر صاحب کا بیان ہے کہ اس کی جائیداد پچاس لاکھ کی مالیت کی ہوگی۔ ہنٹر نے اس کی بہت بُرائی کی ہے۔ اور جی بھر کر گالیاں دی ہیں، یہاں تک کہ سود خوری کا الزام بھی عائد کیا ہے، جو بالکل ناروا ہے۔ اور گو محمد شفیع نے ایک مخلص مسلمان کی حیثیت سے اعلیٰ کردار کا ثبوت نہیں دیا، پھر بھی حق و انصاف کی خاطر ہنٹر کے اس ناروا اتہام کی تردید ضروری معلوم ہوئی۔

۷۔ عبدالکریم انبالوی۔ عمر ۳۵ سال۔ یہ محمد شفیع کا مختار تھا، بعد میں اس کا بھانج

ف۵ اسیرانِ بلا کے کرم فرمائے خصوصی جناب ہنٹر (علیہ ما علیہ) نے سزا کی تبدیلی کی عجیب و غریب توجیہ کی ہے ——— ان کا ایمان بہت قوی تھا ——— اور وہ پھانسی کی سزاؤں کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اسی لئے برطانوی حکام نے ان سے یہ بجا انتقام لیا کہ ان کے بڑے سے بڑے باغی کو بھی درجۂ شہادت حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ (ص ۹۵)

سُبحانَ اللہ! ہائے! ظالم!! تو جہاد و جلاوطنی، قید و مشقت اور سرگردانی و شوقِ شہادت کی لذّت اور اجر کا حال کیا جانے؟

ارے!! وہاں تو نیتوں کا اجر بھی بے حساب ملا کرتا ہے۔

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست

ف۶ تواریخِ عجیب: ص ۹۴

داماد بھی ہو گیا تھا۔ محمد شفیع کی طرح اس کے قدم میں بھی شروع ہی سے لغزش تھی۔ یہ بھی محمد شفیع کے ساتھ بعد میں سرکاری گواہ بن گیا تھا ——— یہ صرف ڈیڑھ دو سال قید میں رہا۔

۸۔ عبدالغفور ولد شاہ علی خاں ساکن ضلع شاہ آباد۔ بہار [ہزاری باغ بہار، حسب روایت مولوی عبدالرحیم صاحب] ——— عمر ۲۵ سال۔ یہ تھانیسر میں مولوی محمد جعفر صاحب کے ہاں مقیم تھا۔ اصل میں یہ الٰہی بخش (ملزم نمبر ۱۱) کا ملازم تھا۔ پہلے عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ پھر دس سال رہ گئی۔ مقدمۂ سازش پٹنہ (۱۸۷۱ء) میں یہ بھی سرکاری گواہ تھا۔ ہنٹر اسے عبدالغفار نمبر ۲ کہتا ہے، جو صحیح نہیں۔

۹۔ حسینی ولد محمد بخش۔ عمر ۲۵ سال، تھانیسر۔ یہ مولانا عنایت علیؒ کی زندگی میں شریکِ جہاد رہ چکا تھا، بعد میں جماعت کے کاموں میں مولوی محمد جعفر صاحب کا معاون ہو گیا تھا۔ مقدمۂ سازش، پٹنہ (۱۸۷۱ء) میں سرکاری گواہ کی حیثیت سے اس کی شہادت ہوئی تھی۔ کُل سات برس یہ قید رہا۔

۱۰۔ حسینی ولد میگھو ساکن پٹنہ۔ عمر ۳۵ سال۔ یہ الٰہی بخش، ملزم نمبر ۱۱ کا ملازم تھا۔ یہ دس برس قید رہا۔ ۱۸۷۱ء کے مشہور مقدمے میں اس کی بھی شہادت ہوئی تھی۔

۱۱۔ الٰہی بخش ولد کریم بخش عمر ۴۲ سال۔ یہ مولانا احمد اللہ صادق پوری متہم مقدمۂ سازش پٹنہ (۱۸۶۵ء) کا مختار تھا۔ اور ارسالِ زر کا زیادہ تر کام اسی کے واسطے سے ہوتا تھا۔ اس کا خود اپنا کاروبار بھی اچھا خاصا تھا۔ حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی تھی۔ پھر دوسرے مقدمہ (۱۸۶۹ء) میں سرکاری گواہ کی حیثیت سے اس کی شہادت ہوئی۔ اور معاف کر دیا گیا۔

ان اسیرانِ بلا میں صرف مقدم الذکر پانچ حضرات اخیر تک ثابت قدم رہے جن میں سے ایک (قاضی میاں جان) نے سزایابی کے بعد انبالہ جیل ہی میں وفات پائی (۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۵ء) اور وہ جوان سب سے ممتاز اور باخدا تھا، دو برس انڈمان میں رہ کر سفرِ آخرت کی راہ لی (۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۸ء) میری مراد جناب مولانا یحییٰ علی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے، جو اپنے تقویٰ اور اخلاص وجہاد کے لحاظ سے دورِ سلف کا نمونہ تھے۔ باقی تین بزرگ زیادہ سخت جان نکلے۔ سیّدی میاں عبدالغفار، مولانا عبدالرّحیم (ف ۱۳۴۱ھ) اور منشی محمّد جعفر صاحب تھانیسری (ف ۱۹۰۵ء) ۱۸۸۳ء / ۱۳۰۰ھ میں انڈمان سے رہا ہو کر وطن واپس آئے اور یہی وہ بزرگ ہیں، جن کی زبانی داستانِ قفس اُڑتی ہوئی کچھ ہم نا آشنایانِ راہ ورسمِ منزل تک پہنچی ہے۔ اس ابتلاء وآزمائش کی داستان کا خلاصہ "اسیرانِ بلا کے مصائب" کے ضمن میں عرض کیا جائے گا۔

ان تمام اسیرانِ بلا میں مولانا یحییٰ علی ہر حیثیت سے خاص امتیاز کے مالک تھے ان کے مختلف کمالات اور خصوصیات کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ سرِدست انبالہ کے سیشن جج سر ہربرٹ ایڈورڈس Sir Herbert Edwards کے ریمارکس یا تأثرات کا پیش کر دینا کافی ہوگا۔ ہنٹر کی زبان میں شاید ہی کسی عدالت نے کسی ملزم کے متعلق ایسے مؤثر الفاظ کہے ہوں۔ سر ہربرٹ سزائے موت کا حکم سناتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

---

[1] ہنٹر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ [مولانا] یحییٰ علی کے مریدوں میں سے کسی نے ان کے خلاف شہادت نہیں دی۔ یہ صحیح ہے لیکن امیر خاں کے مقدمے (پٹنہ ۔ ۱۸۷۱ء) میں بہتوں نے شہادتیں دیں، خواہ جس طرح بھی انہیں دبا دھمکا کر تیار کیا گیا ہو۔ ۱۸۷۱ء کے مقدمے کے متعدد گواہوں نے عدالت میں یہ بیان کیا کہ انہیں فلاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب نے شہادت پر آمادہ کیا۔

"یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ یحیٰی علی ہی اس سازش کا کرتا دھرتا ہے، جس کا انکشاف اس مقدمہ کے دوران میں ہوا۔ وہ ایک مذہبی واعظ تھا۔ اور انتہائی مقدس قاعدے کے مطابق، پٹنہ کی مسجد سے اسلام کے قابلِ نفرت اصولوں کی اشاعت کرتا رہا۔ جہاد کی تبلیغ اور روپلوں کی فراہمی کے لئے، اس نے ماتحت ایجنٹ مقرر کر رکھے تھے۔ اس نے اپنی سازشوں سے برطانی ہند کو ایک ایسی سرحدی جنگ میں دھکیل دیا، جس میں سینکڑوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ وہ مشہور عالم ہیں۔ ان کے متعلق لاعلمی کا عذر نہیں پیش کیا جا سکتا۔ انہوں نے جو کچھ کیا، سوچ سمجھ کر اور عزمِ راسخ کے ساتھ باغیانہ طریقے پر کیا۔ ان کا تعلق ایک موروثی باغی اور جہادی، خاندان سے ہے۔"

(He belongs to a hereditarily disloyal and fanatical family)

ہمارے خاص کرم فرما ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر مولانا یحیٰی علی اور منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری کی سزایابی پر اس طرح اظہارِ ہمدردی فرماتے ہیں:۔

"جعفر، عرضی نویس اور یحیٰی علی واعظ نے وفاداری کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہم سے کوئی مراعات طلب کیں۔ وہ بڑے مخلص اور با اصول آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس زہر آلود ہتھیار سے مجروح کیا، جسے ایک جھوٹے مذہب نے ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ انہوں نے اپنی غداری کی سزا بھگت لی۔ تاریخ ان کے اس انجام کو درمندانہ جذبات کے ساتھ یاد کرے گی۔"

لہ صفحہ ۸۸-۸۷

ہنٹر نے محمد شفیع کے علاوہ تمام 'ماخوذین' کے کردار و اخلاق کی تعریف کی ہے لغزش اور معافی طلب کرنے کے باوجود محمد شفیع ہنٹر کے الزامات کا مستحق نہیں۔ اس مقدمہ سازش اور گرفتارانِ بلا کے متعلق ہنٹر کے خیالات کا اندازہ مندرجہ ذیل بیان سے ہوگا۔

"اس بغاوت کے تین نمایاں پہلو، جو مقدمہ کے دوران میں ظاہر ہوئے یہ ہیں۔ (۱) حیرت انگیز قابلیت، جس سے دور دراز تک پھیلی ہوئی بغاوت کو منظم کیا گیا۔ (۲) رازداری، جس سے اس کی مختلف پیچیدہ کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ (۳) خیر خواہی کا وہ زبردست جذبہ جس نے اس جماعت کے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھا۔ ان کی کامیابی کا راز ان کے دلچسپ فرضی ناموں اور خفیہ زبان میں تھا۔ لیکن میں اس یقین کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محمد شفیع، فوجی ٹھیکہ دار کے سوا یہ سب سازشی اپنا کام انتہائی خلوص اور فطری جوش کے ساتھ اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرض سمجھ کر کرتے اور اس عزم کے ساتھ کہ مرتے دم تک اس فرض کو انجام دیتے جائیں گے۔"

دوسرا مقدمۂ سازش: پٹنہ ۱۸۶۵ء

انبالہ کے مقدمہ کے بعد حکومت اور اس کے ہوا خواہوں کو اس 'جماعت' سے اور کد ہوگئی اور یاروں نے باقی ماندہ ممتاز اشخاص سے انتقام لینے کی فکر شروع کر دی۔ ان انتقامی کارروائیوں کا پہلا شکار سید صاحبؒ کے خلیفہ مولانا احمد اللہ صادق پوری (مولود ۱۲۲۳ھ) کو بنایا گیا۔ مولانا احمد اللہ خلف مولوی الٰہی بخش صاحب جعفری (ف ۱۲۷۵ھ) اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ اس لئے عظیم آباد کے ممتاز رئیسوں میں ان کا شمار

لہ ص ۹۰

تھا اور سرکاری حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی عزت و وقعت کا یہ عالم تھا کہ جب ۱۸۵۷ء میں مسٹر ولیم ٹیلر، کمشنر پٹنہ نے احتیاطی تدبیر کے طور پر انہیں بے قصور گرفتار کر کے حراست میں رکھا[2] تو وہ معطل کر دیا[3] گیا۔ لیکن یہ ٹیلر پٹنہ ہی میں وکالت کرنے لگا اور موقع کی تاک میں لگا رہا۔ جب انبالہ کا مقدمہ شروع ہوا، تو پھر "حریفوں"[1] کی بن آئی اور ٹیلر نے آسمان زمین ایک کر دیا۔ اور حکومت نے مولانا احمد اللہ کو گرفتار کر کے ان پر الگ مقدمہ چلایا (۱۸۶۵ء)۔

یہ مقدمہ پہلے مسٹر منرو (Munro) آفیشیٹنگ مجسٹریٹ کے اجلاس میں پیش ہوا۔ پھر مسٹر انیسلی Ainslie سیشن جج کے اجلاس میں سماعت ہوئی دونوں اجلاسوں میں سزائے موت کا حکم ہوا۔ پھر کلکتہ ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی، تو

---

[1] (W. Taylor) کی کتاب Thirty-eight years in India جلد ۲ صفحہ ۲۴۴-۲۴۳

[2] مولانا احمد اللہ کے ساتھ ان کے ماموں شاہ محمد حسین صاحب (ف ۱۲۶۶ھ) خلیفہ حضرت سید صاحب اور مولوی واعظ الحق صاحب ساکن گورہٹہ، پٹنہ، بھی ۱۸۵۷ء میں نظر بند کر دیے گئے تھے۔ یہ لوگ تین مہینہ نظر بندی کی حالت میں رہے۔ پھر یہ لوگ رہا ہوئے اور ٹیلر معتوب ہو کر معزول کیا گیا۔ (تذکرۂ صادقہ ص ۴۷)

[3] مسٹر ولیم ٹیلر کی معزولی کے سلسلے میں مسٹر (Samvels) ریونیو کمشنر پٹنہ ڈویژن اور گورنمنٹ بنگال کے درمیان جو مراسلت ہوئی تھی، اس کی ایک مطبوعہ کاپی (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۸ء) راقم کی نظر سے گزری ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلر نے بعض مقامی مسلمان رئیسوں [جن کی اولاد اس وقت پٹنہ اور اس کے نواح میں موجود ہے۔] کی چغل خوری پر مولانا احمد اللہ کو گرفتار کیا تھا۔ "(مراسلات ذکورہ)"، ص ۹

سزائے موت حبسِ دوام سے بدل گئی۔ انڈمان بھیجے گئے۔ اور وہاں بھی سرکار کی خاص نوازش قائم رہی۔ اسی عزت اور جلا وطنی کے عالم میں تقریباً سولہ برس زندگی گزار کر ۶۷ سال کی عمر میں جان جان آفریں کے سپرد کی (ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ)

یہ دوسرا مقدمۂ سازش بعض حیثیتوں سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

۱۔ انبالہ والے مقدمے کے "ماخوذین" کا جرم واضح اور ثابت تھا۔ مگر مولانا احمد اللہ کے خلاف کوئی معقول وجہ موجود نہیں تھی۔ ۱۸۶۴ء / ۱۲۸۰ھ تک تو وہ ان معاملات سے گویا الگ تھے ہی۔ آخری سال بھر کے واقعات سے متعلق بھی کوئی قابلِ وثوق شہادت موجود نہیں تھی۔ ان کے مقدمے کی ساری کاروائی اور فیصلے راقم کی نظر سے گزرے ہیں، پورا مقدمہ بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ خود حکام کو اس بات کا اقرار ہے کہ الٰہی بخش (ملزم انبالہ) کی شہادت کے بغیر مولانا احمد اللہ کی سزایابی مشکل تھی[۱]۔ اور الٰہی بخش ۱۸۶۴ء میں گرفتار ہو چکا تھا اور اس کی "مشروط معافی" مولانا کی سزایابی کے بعد ہوئی ہے۔

۲۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس مقدمے کے مجسٹریٹ مسٹر راونشا (T. E. Revenshaw) پہلے شخص ہیں، جنھوں نے باضابطہ مجاہدین کے "اعمال" اور سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ اور سرکاری نقطۂ نگاہ سے ایک نہایت "قیمتی یادداشت[۲]" (Memorandum) حکومت کو بھیجی، جس میں بنگال اور بہار کے تمام مبلغوں اور کارکنوں کی ضلع وار فہرست دی گئی ہے، اور اسی فہرست کے بموجب تقریباً دس سال تک یہ غریب تنگ کئے جاتے رہے اور اسی کی وجہ سے بنگال کے کتنے خوش حال خاندان تباہ

---

[۱] مراسلہ مسٹر (G. F. Cockburn) کمشنر پٹنہ ڈویژن بنام سیکرٹری گورنمنٹ بنگال۔ مورخہ ۱۳ رمئی ۱۸۶۵ء۔

[۲] ضمیمہ کلکتہ گزٹ:۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۸ء۔

وبرباد کردئے گئے۔ مشہور بنگالی قانون دان سرعبدالرحیم (موجودہ اسپیکر مرکزی اسمبلی) نے ایک موقع پر یہ حقیقت ان لفظوں میں ظاہر کی تھی:۔

"۱۸۷۰ء میں حکومت نے وہابی تحریک کے سبب سے جو محض وہم وگمان پر مبنی تھی، بنگال کے مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کی تمام املاک جو رقبہ میں پورے صوبۂ بنگال کی چوتھائی تھیں، ضبط کرلیا۔ جس سے ہزاروں مسلمان خانماں برباد اور پریشان ہو گئے۔" (خطبۂ صدارت مسلم لیگ ۱۹۲۵ء)۔

ممکن ہے، یہ بیان کچھ مبالغہ آمیز ہو، پھر بھی صورتِ حال کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے۔ ہنٹر اور ادکنلے اور دوسرے انگریز لکھنے والوں کا مأخذ راونشا کی یہی یادداشت ہے۔

۳۔ اسی راونشا نے اپنی یادداشت میں پہلے پہل علمائے صادق پور کی غیر منقولہ جائدادوں[۱] کی ضبطی، مکانات[۲] کے انہدام۔ اور سرحد پار مقیم افراد نیز دوسرے کارکنوں کے خلاف سخت کاروائی کی سفارش کی۔

"پٹنہ کے مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ ملزمین کی جائدادِ (منقولہ) پر نیلام نہ بولیں اور بعض چیزیں بہت مشکل کے بعد معمولی قیمتوں پر فروخت کردی گئیں۔"

صادق پور کا احاطہ پٹنہ میونسپلٹی کو دیا جائے اور تمام مکانات زمین کے برابر کردئے جائیں اور وہاں ایک بازار بنایا جائے ـــ ـــ ـــ ـــ میرے خیال میں اس سے زیادہ اچھا مصرف اس زمین کا نہیں ہوسکتا۔

جائداد غیر منقولہ تو سب ضبط ہو ہی گئی۔ جس کی ایک مکمل فہرست راقم نے حاصل کرلی ہے۔ کانگریس وزارت (۱۹۳۷ء۔ ۱۹۳۹ء) کے زمانے میں ایک ممبر کے ذریعہ مجلسِ قانون ساز (بہار) میں صادق پور کی ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق سوال کرایا گیا۔ جس کے جواب میں حکومت نے بڑی تلاش وجستجو کے بعد ضبط شدہ جائداد کی پوری فہرست فراہم کردی تھی۔

راونشا کی سفارش کے بموجب مکانات بھی زمین کے برابر کر دئے گئے تھے اور اب وہاں پر پٹنہ سٹی میونسپلٹی کی عمارت قائم ہے۔ ۱۹۳۴ء کے زلزلے میں اس کی دوبارہ مرمت ہوئی، مگر تاریخ قائم شدہ ۱۸۶۵ء؛ (Established 1865) اس پر درج ہے میونسپلٹی کے باہر چھوٹا سا بازار بھی ہے۔ جائداد غیر منقولہ کی ضبطی کے سلسلے میں سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ مولانا احمد اللہؒ کا قیمتی کتاب خانہ بھی ضائع کر دیا گیا۔ مولاناؒ کے بڑے بیٹے حکیم عبدالحمید عظیم آبادی (جو اس وقت نوجوان طبیب تھے اور بعد میں ادیب وطبیب کی حیثیت سے ہمہ گیر شہرت حاصل کی، اور "اُستاذ الاساتذہ" کے درجے پر فائز ہوئے۔ اُستاذِ محترم مولانا سیدنا سلیمان ندوی مدظلہ، انہیں "خاقانی ہند" کے لقب سے یاد کرتے ہیں) کا مختصر سا دواخانہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ مثنوی شہر آشوب میں لکھتے ہیں۔

نامِ نان ونشانِ قوت میسّر ۔۔۔ صورتِ قوت لایموت میسّر
حالِ قوت ونشان و منزلِ من ۔۔۔ عالم الغیب داند و دلِ من
یک دواخانہ وجہ قوتم بود ۔۔۔ مایۂ قوت لایموتم بود
آمد آں خانہ ہم بمعرضِ ضبط ۔۔۔ شُد ہمہ نظم روزیم بے ربط الخ الخ

اس "چنگیزی" حکم کے بعد کیا ہوا؟ اس کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ مختصر یوں سمجھئے کہ خاندانِ صادق پور کی تمام عورتیں اور بچے حکیم ارادت حسین صاحب (ف مکہ معظمہ ۱۲۹۶ھ)

۱؎ تمام متاخرین علمائے صادق پور انہیں کے شاگرد ہیں۔ جس طرح اکثر متقدمین حضرات صادق پور ان کے والد ماجد مولانا احمد اللہؒ (ف ۱۲۹۸ھ) کے شاگرد تھے۔ خاقانی ہند حکیم عبدالحمیدؒ صاحب عظیم آبادی (ف ۱۳۲۳ھ) سے راقم کو بھی نسبت کا شرف حاصل ہے۔ استاذی ووالدی مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مدظلہ، (مولود ۱۲۹۰ھ) نے ان سے طب کی تحصیل کی تھی۔

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

کے مکان میں پناہ گزیں ہوئے۔ حکیم صاحبؒ بھی خاندانِ صادق پور سے قریبی تعلق رکھتے تھے مگر وہ مقدمۂ انبالہ کے بعد ہی مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے (رجب ۱۲۸۱ھ / نومبر ۱۸۶۴ء) اور وہیں تیرہ برس زندگی گزار کر مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہوگئے۔ اس لئے ان کا مکان اغیار کی دست برد سے بچ گیا۔ اور پورے صادق پور میں یہی ایک مکان ہے، جو اپنے حال پر اب تک باقی ہے[1]۔ مردوں میں صرف حکیم عبدالحمید صاحب دیکھ بھال کے لئے تھے، مولوی محمد حسن صاحبؒ بن مولانا ولایت علی صاحبؒ اولاً تو بہت کم سن تھے۔ دوسرے وہ کلکتہ سے لے کر انبالہ تک مقدموں کی پیروی میں سرگرداں تھے۔ حکیم صاحب نے اپنی مثنوی میں اس بے کسی اور خانہ ویرانی کا دردناک منظر کھینچا ہے۔

کنم الحال مختصر مرقوم	ماجرائے عیالِ آں[2] مظلوم
چوں شبِ عید را سحر کردند	ہمہ را از مکاں بدر کردند
ضبط و تاراج جملہ مال و متاع	نقد و جنس و ہمہ اثاث و ضیاع
مہر مالبود... آہ جرمے سخت	بردنِ سوزنے ز جملہ رخت
احدے را نہ بد چہ مرد و چہ زن	حکم ہمراہ بردنِ سوزن
ہمہ سرگشتہ بے سر و ساماں	نہ غمِ جیب و نہ غمِ داماں
من نہ تنہا کہ ہمرہم تنہا	بچگان و زنان و شیو مہا
مایۂ عیش ساز ماتم شد	عیدِ ما غرۂ محرم شد

یہ "خانہ ویرانی" ٹھیک عید کی صبح کو شروع ہوئی (۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء) آزمائش پر آزمائش،

۱؎ حکیم ارادت حسین صاحب (ف ۱۲۹۴ھ) کا پرانا گھر اب تک آباد ہے۔ ان کے پوتے خاندان کی روایات کے محافظ اور عالم باعمل ہیں۔ مولانا عبدالغفار صاحب ان میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔

۲؎ حکیم عبدالحمید صاحبؒ کا اشارہ اپنے والد مولانا احمد اللہؒ کی طرف ہے۔

کریلا اور نیم چڑھا، کہنا شاید صحیح ہو۔

"کتاب خانہ" کی بربادی پر حکیم صاحب کے تاثرات بھی قابلِ "عرض" ہیں۔

کتبِ ملّتِ مسلماناں — رخت دردستِ حرفِ ناخواناں
داند اوہر کہ بانیند بود — مالِ یغما کرا عزیز بود
راست گوینده ایں مثل گفت است — دل بے رحم و دولت مفت است

ان بیچاروں کی قلبی حالت کیا تھی؟ اس کا اندازہ لگانے کے لئے مثنوی کے یہ تین شعر کافی ہیں:۔

صرصر فتنہ چوں وزیدے تن — حسب حال ایں دوبیت دل می خواند
دلِ ظالم بقصد کشتنِ ماست — دلِ مظلومِ ما بسوئے خدا است
او دریں فکر تا بما چہ کند — ما دریں فکر تا خدا چہ کند

راونشا نے تو صرف مکانات کے انہدام کا مشورہ دیا تھا۔ مگر "ذمہ دارانِ امن و امان" نے قبریں بھی کھود ڈالیں۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری (ف ۱۳۴۱ھ) جب بیس سال

لہ صادق پوری کتابیں آج بھی پٹنہ کی مختلف لائبریریوں میں نظر آجاتی ہیں۔ خدا بخش اورینٹل لائبریری میں راقم کی نظر سے علمائے صادق پور کی مُہر کردہ بعض کتابیں نظر سے گزری تھیں۔ ابھی ابھی پچھلے دنوں ایک عزیز کے ہاتھ میں پٹنہ کالج لائبریری سے مستعار لی ہوئی ایک کتاب دیکھی، جس پر جا بجا (فرحت حسین ۱۲۵۸ھ) کی مہر لگی ہوئی ہے۔ دیکھنے میں یہ کتاب نہیں، بلکہ چند کتابوں کا مجموعہ ثابت ہوا۔ اور کتابیں بھی سب کی سب توحید و دعوت جہاد سے متعلق۔ اس سے زیادہ عبرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ مجموعہ پٹنہ کے ایک رئیس (جو چغل خوری میں شریک تھے) نے پٹنہ کالج لائبریری کو ہدیہ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "لوٹ" کے مال کا کچھ حصہ ان "امین" کے لوگوں کو بھی مل گیا تھا۔

کے بعد انڈمان سے واپس ہوئے (سنہ ۱۳۰۱ھ) تو خاندانی قبرستان کا یہ دلدوز منظر دیکھ کر دل بھر آیا اور "کراماً کاتبین" کی انتہائی سختی کے باوجود ان کی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپک پڑے۔

"---------- بہرکیف میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کے بنگلے سے رخصت ہوکر محلہ نمو ہیٹہ میں پہنچا۔ جہاں کہ میرے اہل وعیال مقیم تھے۔ اس کی صبح ہوکے صادق پور[1] گیا۔ تو وہاں دیکھا کہ ہم لوگوں کے مکانات کل منہدم کر کے کفِ دست میدان بنا دیا گیا ہے اور اس پر بازار اور میونسپلٹی کے مکانات بنا دیئے گئے ہیں۔ میں نے چاہا کہ اپنے خاندانی مقبرہ کو کہ جہاں چودہ پشت سے ہمارے آباؤ اجداد دفن ہوتے چلے آئے تھے، جا کر دیکھوں۔ اور خصوصاً اپنے والدین ماجدین غفر اللہ لہما کے مزار کی زیارت کروں، اور اس پر دعائے مغفرت اور فاتحہ پڑھوں۔ مگر ہر چند کوشش کی، پتہ نہ ملا۔ بعد تجسس و بسیار وغور وفکر کر کے قرینہ سے معلوم ہوا کہ حضرت والدین ماجدین کی قبریں کھود کر اس پر بنائے عمارت میونسپلٹی بنا دی گئی ہے:-"

یَا مَنْزِلاً لَعِبَ الزَّمَانُ بِاَهْلِهٖ فَاَبَادَهُمْ بِتَفَرُّقٍ لَا یَجْمَعُ

اے وہ منزل، جس کے رہنے والے زمانے کے دست برد کے شکار ہوئے اور انہیں زمانے نے ایسا منتشر کیا کہ پھر جمع ہونے کی توقع نہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ عَهِدْتُهُمْ بِكِ مَرَّةً كَانَ الزَّمَانُ بِهِمْ یَضُرُّ وَ یَنْفَعُ

وہ جنہیں میں نے کبھی تیری آغوش میں آسودہ حال دیکھا تھا، زمانہ ان کے سہارے نفع ونقصان پہنچاتا تھا۔

---

[1] صادق پور اور موجودہ بانکی پور کے درمیان شہر پٹنہ کا ایک محلہ۔

اصبحت تفزع من تراک وطالما کنا الیک من المھا ول نفزع

جو تجھے اب دیکھتا ہے، گھبرا اٹھتا ہے۔ اور کبھی مشکلات سے گھبرا کر ہم تیری آغوش میں پناہ ڈھونڈھتے تھے۔

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم بقی الذین حیاتھم لا تنفع

وہ لوگ تو گزر گئے، جن کے سائے میں زندگی، زندگی تھی۔ اب وہ لوگ رہ گئے ہیں، جن کی زندگیاں کسی کام کی نہیں [۱]

اے حضراتِ ناظرین۔ اس وقت اس حرکت کا جو ہمارے اموات کے ساتھ کی گئی، جو صدمہ دل پہ گزرا۔ وہ بیرون از حیطۂ تقریر و تحریر ہے۔ اس وقت تک اس کی یاد سے بدن کے رونگٹے تک کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے جرم میں ہمارے اموات و آباؤ اجداد کی قبریں کیوں کر کھودی گئیں۔ اور وہ مقبرہ کیوں معرضِ ضبطی میں آیا؟ ہماری "عادل گورنمنٹ" نے کیوں یہ کام کیا؟ (تذکرۂ صادقہ: صفحہ ۱۷۹)

۴ • صادق پور کے مکانات کے انہدام کے علاوہ راونشا صاحب کی ایک سفارش یہ تھی۔

"مقیم سرحد مولویوں کے خلاف سخت کاروائی کی جائے۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی جائیں اور ان کے مقامی کارکنوں پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔ خاص کر حاجی بدرالدّین (ڈھاکہ) اور مولوی عبدالجبّار (کلکتہ) پر مقدمہ چلانا ضروری ہے۔" (یادداشت نمبر ۲۲-۳۰)

راونشا کی یہ سفارشیں مقبول ہوئیں اور پورے بہار اور بنگال میں دار و گیر کا بازار سالہا سال تک گرم رہا۔ ان سفارشوں کی قبولیت کی اطلاع سکریٹری بنگال گورنمنٹ نے کمشنر پٹنہ ڈویژن کو ان لفظوں میں دی [۲]۔

---

[۱] ان شعروں کا ترجمہ قصداً لفظی نہیں کیا گیا۔

[۲] مراسلہ نمبر ۵۲۱، مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء۔

(۱۰ ـــــــــــــــــــــــــ

(۱۱) حکومتِ پنجاب سے الٰہی بخش کی معافی کی کوشش کی جائے گی، نیز اس کے مکان اور پانچ سو روپے کی واپسی کی۔

(۱۷ ــ ۱۱۱) ـــــــــــــــــ

(۷) یہ تجویز کہ صادق پور کا احاطہ پٹنہ میونسپلٹی کو دے دیا جائے تاکہ اسے زمین کے برابر کر دیا جائے اور اس جگہ ایک کھلا بازار بنایا جائے۔ حکومتِ ہند میں پیش کی جائے گی۔ لفٹیننٹ گورنر کی رائے ہے کہ جائداد غیر منقولہ کی آمدنی کا بھی ایک حصہ میونسپلٹی کو دیا جائے۔

(۷۱) لفٹیننٹ گورنر ان اشخاص کے خلاف جن کا ذکر مسٹر راونشا کی رپورٹ کی دفعہ نمبر ۳۲ میں آیا ہے۔ قانون ضابطۂ فوجداری (دفعہ ۱۹۹ - ۱۸۳) کے ماتحت فوری کارروائی کی اجازت دیتے ہیں۔

اس دوسرے مقدمۂ سازش کی مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ اس کا مقصد صرف خاندانِ صادق پور اور ان کے اعوان و انصار کو تباہ و برباد کرنا تھا۔ خاندان کا دنیوی جاہ و جلال تو اسی مقدمے کی نذر ہوگیا۔ رہ گئے اعوان و انصار، ان میں جو سخت جان رہ گئے تھے۔ ان کے لئے تین مقدمے اور چلائے گئے۔ (مالدہ ستمبر ۱۸۷۰ء، راج محل اکتوبر ۱۸۷۰ء، پٹنہ مئی ۱۸۷۱ء) ان 'مقدمات' میں کیا کیا ہوا اور ناکردہ گناہوں کو سزا دینے کے لئے کیا کیا جتن کئے گئے اس کے متعلق ایک واقف کار اور مبتلائے الم کے تاثرات ملاحظہ ہوں:۔

"جو آگ گرفتاریٔ وہابیان ۱۸۶۳ء میں ہنفانیسر میں روشن ہوئی تھی۔ اس کو روز بروز ترقی ہوتی گئی ـــــــــ آخر کو ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے تو سراسر من ولائتی بارود اور کرشن آئیل اس میں ڈال دیا اور ہماری سرکار کو یہاں تک بھڑکایا کہ صادق پور پٹنہ کے وہ

مکانات کہ جن میں قافلہ کے لوگ ٹھہرا کرتے تھے۔ مع مکانات سکنی ان فرضی باغیوں کے کھدوا کر پھکوا دئے مگر اس پر بھی سرکار کا دل ٹھنڈا نہ ہوا۔ ۱۸۷۲ء کے آخر تک پٹنہ اور بنگال میں سلسلۂ گرفتاری بے گناہاں کو جاری رکھا۔ بیچارہ امیر خاں سوداگر چرم اور مولوی تبارک علی وغیرہ بہت سے آدمی پٹنہ میں پکڑ لئے۔ مولوی امیر الدین صاحب کو پٹنہ میں جا پکڑا۔ ایک بوڑھے اور ضعیف شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں ——— اور اپنے معمولی اور پرانے گواہوں سے جو چاہا، گواہی دلوا کر بیچاروں کو کالے پانی کو روانہ کیا اور امیر خاں کی چند کروڑ کی جائداد سے اپنا کل خرچہ پورا کر لیا۔[۱]" — — — — — —

"اور پھر ۱۸۷۱ء تک جو جو مقدمات گرفتاریٔ وہابیان مثل مقدمہ امیر خان صاحب سوداگر چرم و تبارک علی صاحب و مولوی امیر الدین ساکن پٹنہ و ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور ہوتے رہے، تو بھی معمولی گواہ یا گویندۂ سرکار جھوٹی گواہی دینے کو بلائے جاتے تھے۔ اور میں نے خود اُن میں سے ایک گواہ کی زبانی سنا ہے کہ جب کبھی خلاف گواہی دینے سے ہم نے انکار بھی کیا تو ہم کو یہ کہا گیا کہ تم لوگ شرطیہ طور پر فقط اسی گواہی دینے کے واسطے بطور گویندہ رہا کئے گئے ہو اگر گواہی نہ دو گے تو پھر تم کو دائم الحبس کر کے پہلے ہی وارنٹ پر کالے پانی کو بھیج دیا جائے گا۔"

(تاریخ عجیب۔ صد ۷۹)

تیسرا مقدمہ سازش: مالدہ ۱۸۷۰ء

مالدہ اور راج محل کے مقدموں کی تفصیلی روداد نہیں مل سکی پھر بھی انبالہ اور پٹنہ کے دونوں مقدموں (۱۸۶۵ء اور ۱۸۷۱ء) کی رپورٹوں اور سرکاری کرم فرماؤں کی تحریروں سے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ درج ذیل ہے:۔

---

[۱] تواریخ عجیب: صد ۷۶، ۷۷

"مقدمہ انبالہ کے بعد وہابی اپنا پروپگنڈا کرتے رہے۔ تاآنکہ حکومت تشدد پر مجبور ہوگئی۔ اور مختلف مقدمات چلائے گئے۔ ۱۸۶۵ء کا مقدمہ سازش، پٹنہ بھی اسی سلسلے میں چلایا گیا تھا۔ پھر کچھ سراغ ملا۔ تو ۱۸۷۰ء میں مالدہ اور راج محل کے مقدمے دائر ہوئے۔[1]"

۱۸۷۰ء کے دو مقدموں میں، پہلا مالدہ میں مولوی امیرالدین پر چلایا گیا۔ مولوی امیرالدین کون تھے؟ ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

"مولانا ولایت علی کے خلیفہ عبدالرحمٰن لکھنوی نے مالدہ میں تبلیغ کی اور وہیں بس گئے۔ ان کے کارکنوں میں ایک صاحب رفیق منڈل نامی تھے۔ وہ ۱۸۵۳ء میں گرفتار ہوئے، پھر رہا کر دیئے گئے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے بیٹے امیرالدین کے ذمہ یہ خدمت کی ۱۸۶۵ء کے مقدمے کے دوران میں امیرالدین کی شرکت کا راز کھلا۔ لیکن وہ اپنا کام کرتا رہا۔ ان کے حلقے میں پورا مالدہ ضلع اور راجشاہی اور مرشدآباد کے کچھ حصے تھے۔[2]"

"ایک شخص عبدالرحمٰن نامی (خلیفہ مولانا ولایت علیؒ) مالدہ، تبلیغ کرتے ہوئے آئے پھر وہ وہاں رہ پڑے۔ شادی کر لی اور ایک اسکول میں معلم ہوگئے۔ ان کی تبلیغ کامیاب ہوئی، آدمی اور رقم سرحد کو بھیجتے رہے۔ سالہا سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۵۳ء میں ان پر شبہ ہوا، گرفتار ہوئے پھر چھوڑ دئے گئے۔

"اس کے بعد ان کا کام ان کے[3] بیٹے مولوی امیرالدین نے سنبھالا۔ جنہوں نے اپنے

---

[1] ہنٹر: ص ۹۷ [2] جنرل رایل ایشیاٹک سوسائٹی، بمبئی: جلد ۱۴ صفحہ ۳۲

[3] ہنٹر نے مولوی امیرالدین کو مولوی عبدالرحمٰن کا بیٹا لکھا ہے۔ حالانکہ اس کے "پیش رو" اور "گرو" راونشا نے (ولد رفیق منڈل) کی تصریح کی ہے —— نیز رفیق منڈل کے حالات میں راونشا لکھتا ہے "اس کا بیٹا شکور محمد آج کل ستھانہ میں رہتا ہے اور دوسرا لڑکا، جس کا نام نہیں معلوم آج کل مضافات میں تبلیغ و تحصیل کا کام کرتا ہے۔"

فرائض نہایت خوبی سے انجام دیئے۔ مقدمۂ پٹنہ ۱۸۶۵ء میں ان پر شبہ ہوا تنبیہ کی گئی۔ لیکن یہ اپنا کام زور و شور سے کرتے رہے اور مقدمۂ مالدہ کے افسر انچارج کے غیر جانبدارانہ بلکہ ایک حد تک قدر دانی کے الفاظ میں اُس نے اس وقت سے لے کر گرفتاری تک نہایت ایمانداری سے جہاد کو جاری رکھنے کے لئے بھرتی کرنے کی کوشش کی[1]،،

راونشا کی یادداشت میں مالدہ کے کارکنوں کے بارے میں حسب ذیل بیان ملتا ہے۔

"راجشاہی کی طرح اس ضلع میں بھی جماعت بہت نمایاں ہے۔ ـــــ

اسی زمانے میں شفیع اللہ منڈل نے ـــــ روپے جمع کئے جو ایک ـــــ مولوی کو دئے، جو چند مریدوں کے ساتھ گاؤں میں تبلیغ کے لئے آیا تھا۔ اس مولوی کا نام امیرالدین (ولد رفیق منڈل) ہے۔ کچھ دن ہوئے، یہ بغاوت پھیلانے کے جرم میں گرفتار بھی ہوا تھا اور مرشد آباد جیل میں محبوس رہا تھا۔"

انہی مولوی امیرالدین صاحب پر مالدہ میں 'بغاوت' کا مقدمہ دائر کیا گیا۔ ہائی کورٹ سے حبسِ دوام بعبور دریائے شور اور املاک کی ضبطی کی سزا ہوئی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں انڈمان پہنچے۔

مولوی محمد جعفر صاحب کے بیان کے مطابق انہیں انڈمان میں ایک مدت تک سخت مشقت برداشت کرنا پڑی۔ بعد میں ایک مدرسہ کے معلم بنا دئیے گئے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں عام رہائی کے حکم سے انہیں بھی فائدہ اٹھانے کا موقعہ مل گیا اور صرف دس گیارہ سال جلا وطنی میں بسر کرنے کے بعد وطن واپس ہو گئے[2]۔

---

[1] ہنٹر: صد ۲۷
[2] تواریخ عجیب: صد ۷۷

چوتھا مقدمۂ سازش: راج محل اکتوبر ۱۸۷۰ء

راج محل[1]، صوبہ بہار، بھاگلپور کمشنری کے اندر واقع ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ مالدہ ضلع، گو بنگال میں ہے، لیکن دریا کی راہ سے راج محل اور مالدہ بالکل ملے ہوئے ہیں۔ راج محل کے نواح میں ایک قصبہ اسلام پور ہے۔ وہیں ایک بزرگ ابراہیم منڈل تھے، جنہیں مجاہدین کی تحریک سے خاص دلچسپی تھی۔ منڈل اس نواح میں چودھری یا پٹیل کو کہتے ہیں۔ راونشا کے "اسماء الرجال" میں کئی بزرگ "منڈلی" کے نام سے موسوم نظر آتے ہیں۔ یہ لفظ منڈل ہے۔ یہ قصبہ اسلام پور آج بھی اس نواح میں اپنی دینداری اور اخلاقی برتری کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ راقم نے اپنے ملنے والوں میں پروفیسر عبدالباری[2] کو ان لوگوں کی دینداری کا بہت مدّاح پایا۔ اسی طرح میرے ایک دوسرے دوست منظور احسن صاحب (کمر ڈبی۔ مان بھوم) جو اسی علاقے میں پتھروں کا کاروبار کرتے ہیں، خاص طور پر اسلام پور والوں کی مذہبیّت کی تعریف کرتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ مالدہ کے بعد فوراً ہی راج محل میں ابراہیم منڈل پر مقدمہ دائر کیا گیا۔ (اکتوبر ۱۸۷۰ء) اور تمام ملزموں کی طرح انہیں بھی "شہادت" سے محروم رکھا گیا۔ اور صرف "حبسِ دوام بعبور دریائے شور اور ضبطیٔ جائداد" کی سزا ہوئی۔ ابراہیم منڈل کے متعلق ذاتی تحقیق سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ اصحابِ صادق پور میں سے کسی کے مرید تھے اور راج محل کے علاقے میں ان کی دھاک تھی۔ اب بھی ان کے خاندان کے لوگ

---

[1] راج محل پہلے مالدہ ضلع میں تھا۔ پھر مرشد آباد (بنگال) میں ضم کر دیا گیا۔ آج کل سنتھال پرگنہ (بھاگلپور کمشنری۔ بہار) میں شامل ہے۔

[2] بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر جو اسی حلقے سے اسمبلی میں منتخب ہوا کرتے تھے۔

خوش حال ہیں، مگر وہ آگ ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ ان کے وطن اسلام پور میں ایک مدرسہ بھی ہے رسالہ اشاعت السنہ[1] سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ امیر خاں کے ساتھ ۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن (۱۸۷۶ء۔ ۱۸۸۰ء) کے حکم سے رہا کر دیئے گئے تھے اور غالباً انڈمان بھی نہیں بھیجے گئے۔ ہمارے مہربانِ خاص، ہنٹر صاحب نے بھی مالدہ اور راج محل کے مقدموں کی طرف صرف سرسری طور پر اشارہ کیا ہے:۔

"۱۸۷۰ء میں ایسے (یعنی اضلاع کے) دو مرکز (Sehlements) توڑ دیئے گئے۔ ان کے سرکردہ مبلّغوں کو غیر جانبدار عدالتوں سے عبور دریائے شور اور ضبطیٔ املاک کی سزا ہوئی۔ ان کی سازش کا جال، برطانیہ کے علاوہ کسی کمزور حکومت کو بہ آسانی مرعوب کر سکتا تھا[3]۔"

غیر جانبدار عدالتوں کا تجربہ تو اس ملک کے ستم زدوں کو ہزار بار ہو چکا ہے۔ اس لئے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ اس سلسلے میں یہ بیان شدید دلچسپی سے سنا جائے گا کہ مجاہدین کے ایک بڑے کرم فرما اور ان سب میں جماعت سے زیادہ واقف مسٹر ڈاوکنلے (James Okinesly) ان مقدموں میں خاص طور پر سرکار کی طرف سے پیروکار مقرر کئے گئے تھے۔ اور انہوں نے ہمیں راج محل میں بیٹھ کر مولانا کرامت علی جونپوری (ف ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء)، جن کے بارے میں یہ لکھ آئے ہیں کہ ان کی روش، سید صاحب کے اصحابِ خاص کے مسلک سے الگ ہو گئی تھی) کو یہ 'سند' عطا کی تھی[4]۔ جسے ان کے عزیزوں اور

---

[1] مزید تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے انتقال کو چالیس پینتالیس برس ہوئے ہیں ان کے پوتے اس وقت زندہ ہیں اور ابھی ایسے لوگ زندہ ہیں، جنہوں نے ابراہیم منڈل کو دیکھا ہے۔

[2] جلد ۵ صہ ۱۲   [3] صہ ۲۰

[4] مورخہ ۳۱ ر اکتوبر ۱۸۷۰ء، یعنی مقدمہ میں پیروی کے دوران میں یا دو چار دن بعد۔

معتقدوں نے ۱۹۱۴ء میں نہایت دیدہ زیب طریقے پر طبع کرایا تھا تاکہ وقت پر کام آئے۔

مولانا کرامت علی جون پوری کی تمام تصنیفات پڑھنے کی میں نے مسرت حاصل کی ہے اور میں اپنے علم کی بنا پر شہادت دے سکتا ہوں کہ انھوں نے اپنے کو ہمیشہ ایک راسخ العقیدہ (Orthodox) حنفی عالم، وہابیوں کے کٹر دشمن (Persistent Opponent) اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ہوا خواہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔[1]

پانچواں مقدمۂ سازش: پٹنہ ۱۸۷۱ء

یہ آخری مقدمۂ سازش، پٹنہ میں دائر ہوا اور بعض حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے پہلی مارچ ۱۸۷۱ء میں مسٹر باربر (D. M. Barbour) آفیشیٹنگ جائنٹ مجسٹریٹ، پٹنہ کے اجلاس میں اس کی سماعت ہوئی۔ مجسٹریٹ نے ۲۷ مارچ کو ملزموں پر فردِ جرم عائد کر کے سیشن سپرد کیا اور پہلی مئی کو مقدمہ کھلنے پر کل ۱۳۶ سرکاری گواہوں اور کچھ ملزموں کے گواہوں کو حاضری کا حکم دیا گیا۔

یہ گواہ (شمالی) ہندوستان کے تقریباً ہر حصے کے تھے۔ پشاور، ہزارہ اور مادارئے سرحد سے لے کر مدناپور اور باقر گنج جیسے مشرقی اضلاع (بنگال) سے یہ گواہ لائے گئے تھے۔ بعض عذروں کی بنا پر کلکتہ ہائی کورٹ کو انتقالِ مقدمہ کی درخواست کی گئی اور اس لئے ۱۳ مئی تک سماعت ملتوی رہی۔ ہائی کورٹ نے انتقالِ مقدمہ کی درخواست نامنظور کی۔ تو التواء کی درخواست دی گئی۔ جس پر ہائی کورٹ نے ۲۹ مئی تک سماعت کے التواء

---

[1] ہنٹر نے بھی مولوی کرامت علی صاحب کے ایک وفادارانہ فتوے کا ذکر کیا ہے۔ (ص ۱۰۰)

کا حکم دیا۔

یہ حکم بالکل غیر عادی تھا۔ اس لئے کہ اس عدالت میں کوئی ایسی درخواست نہیں دی گئی تھی، جس پر اسے تعزیرات ہند کی دفعہ (۳۶۱) کے مطابق غور کرنے کا موقع ملتا۔

اس کے بعد جج صاحب نے ہائی کورٹ کی زیادتیوں کا شکوہ کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مقدمہ ۳۰ رمئی کو شروع ہوا۔ اور کچھ وقفوں کے ساتھ ۱۹ رجولائی تک جاری رہا کل ۳۸ روز مقدمے کی سماعت ہوئی۔ جس میں سب ملاکر ۱۵۹ گواہ پیش ہوئے۔ ان کے علاوہ خطوط اور کاغذات کے انبار نے بھی اچھا خاصا وقت لیا۔[1]

اس مقدمے میں کل سات ملزم تھے:۔ ۱۔ پیر محمد، ۲۔ امیر خان، ۳۔ حشمداد خاں ۴۔ مبارک علی، ۵۔ تبارک علی، ۶۔ حاجی دین محمد، ۷۔ امین الدین۔

ملزموں میں جماعتی حیثیت سے سب سے زیادہ اہم مولوی مبارک علی صاحب تھے ان کا ذکر تنظیم جماعت کے سلسلے میں آچکا ہے۔ مولانا احمد اللہؒ (ف ۱۲۹۸ھ) کی گرفتاری (۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۵ء) کے بعد یہ جماعت کے نظم و نسق کے ذمہ دار ہوگئے۔ انبالہ اور پٹنہ کے مقدموں کی پیروی میں مولوی محمد حسن صاحب (ف ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) کی بڑی مدد کی۔ انبالہ کا سفر بھی کیا۔ آخر ۱۸۶۸ء / ۱۲۸۴ھ میں گرفتار ہوئے۔ پھر ۱۸۷۱ء کے آخری مقدمۂ سازش میں دھر گھسیٹے گئے۔ اور سخت اذیت دی گئی، تاآنکہ اسی حال میں روح نے جسم خاکی سے رہائی حاصل کی۔ (ف تقریباً ۱۲۸۸ھ)۔

ان کے صاحبزادے مولوی تبارک علی بھی اس مقدمے میں ماخوذ تھے۔ "جرم" کی نوعیت کے لحاظ سے ان کا نام سب سے پہلے آنا چاہیئے۔ ان پر الزام یہ تھا کہ مولوی

---

[1] وہابی ٹرائل۔ ص ۱۵۱

عبداللہ رح (ف ۱۳۲۰ھ) کے ساتھ امبیلا کی مہم (۱۸۶۳ء) میں یہ شریک تھے۔ اور ایک دستے کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ حاجی دین محمد اور امین الدین پر باغیوں کی اعانت کا الزام تھا۔ حشمداد خاں کو سیشن جج نے رہا کر دیا کہ ان کے خلاف بادی النظر میں مقدمہ (Prima Facie case) ثابت نہ ہو سکا۔[1] پیر محمد ہائی کورٹ سے بری ہوئے لیکن ان سب میں عجیب و غریب معاملہ امیر خان کا ہے اور آخری مقدمے کی ساری اہمیت ان ہی کی وجہ سے ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر "ملزم" مختلف وقتوں میں گرفتار کئے گئے اور کبھی کبھی درمیان میں رہا بھی کئے گئے۔ لیکن مقدمہ ۱۸۷۱ء میں ایک ساتھ چلایا گیا۔ مولوی مبارک علی ۱۸۶۸ء میں مشتبہ خطوط کے سلسلے میں گرفتار کئے گئے۔ حاجی دین محمد، پیر محمد تبارک علی ۱۸۶۸ء، ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۰ء میں مختلف وارنٹوں کے ماتحت گرفتار کئے گئے۔ اور بار بار ممالک مغربی و شمالی (موجودہ صوبہ جات متحدہ) اور پنجاب کی جیلوں میں منتقل کئے گئے۔[2]

ایک مزے کی بات یہ ہے کہ مبارک علی، تبارک علی، امین اور حاجی دین محمد جو مختلف وقتوں (۱۸۶۸ء۔۱۸۶۹ء) میں شاہی قیدی[3] (State prisoners)

---

[1] وہ مقدمہ جس میں شہادت ایسی ہو کہ اس کی تردید کے لئے فریق مخالف کو لازماً جواب دہی کرنی پڑے (Prima Facia) کا لفظی ترجمہ (On the face of it) (بادی النظر میں) ہے۔

[2] وہابی ٹرائل صہ ۱۴۲

[3] سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری میں اسٹیٹ پرزنر کا ترجمہ 'سیاسی قیدی' دیا ہے۔ جو مفہوم کو ادا نہیں کرتا۔ راقم نے 'شاہی قیدی' کا فقرہ تراشا ہے، مگر طبیعت مطمئن نہیں۔

کی حیثیت سے گرفتار کئے گئے تھے۔ جنوری ۱۸۷۱ء میں رہا ہوئے اور پھر اس مقدمے کے لیے "از سرِ نو" گرفتار کئے گئے۔

لیکن جیسا کہ راقم نے ابھی عرض کیا، ان سب "اسیرانِ بلا" میں امیر خاں کا معاملہ سب سے عجیب و غریب ہے۔ یہ پٹنہ، محلہ عالم گنج کے رہنے والے اور کروڑپتی تاجر تھے ان کا چمڑے کا کاروبار بنگال اور بہار میں پھیلا ہوا تھا۔ اور بڑے بڑے انگریز تاجر بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ ان کی تجارت تباہ کرنے اور ساری جائداد ضبط کرنے کے لئے ان پر اتنا "شاندار مقدمہ" تصنیف کیا گیا، جس میں ۱۱۳ سرکاری گواہ پیش ہوئے اور مسٹر اوکنلے جیسے "گرگِ باراں دیدہ" کو سرکاری پیروکار مقرر کیا گیا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ امیر خاں کو مجاہدین اور ان کے نصب العین سے لگاؤ تھا، خود حضرت سید شہیدؒ یا مولانا ولایت علیؒ صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) سے بیعت تھی۔ اور جہاد کے کاموں میں روپے سے مدد کیا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کی رقمیں باضابطہ طور پر ادا کرتے۔ بنگال کے مشرقی اضلاع سے جو رقمیں آتیں، وہ لبسا اوقات انہیں کے کلکتہ والے فرم کے واسطے سے پٹنہ اور پنجاب کو بھیجی جاتیں۔ مگر حکومت نے انہیں سزا دینے اور ان کی جائداد کی ضبطی کے لئے جو کارروائیاں کیں، وہ اسی حکومت کے قانون دانوں اور ہوا خواہوں کی نگاہ میں غیر منصفانہ اور خلاف قانون تھیں۔

مسٹر رہٹسک (E. Rehatsek) نے اس مشہور مقدمے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ انہیں کے لفظوں میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس سے اس مقدمۂ سازش کی غرض و غایت، معلوم ہو جائے گی:۔

"وہابی، حکومت، نیز دوسرے مسلمان فرقوں کی نگاہوں میں جس قدر بدنام ہیں، اس لئے امیر خان اور حشمداد خان نامی قیدیوں نے جن کا مقدمہ جسٹس نارمن (Norman) کلکتہ ہائی کورٹ کے اجلاس میں پیش ہوا تھا، اور اپنے وہابی

ہونے کا اقرار نہیں کیا۔ اسی لئے ایک پمفلٹ مشہور وہابی مقدمہ (The Greatwahābi) کے مرتب کرنے والے کہتے ہیں کہ انہوں نے صرف مقدمے کا مشہور نام قایم رکھا ہے۔ ان کا یہ مقصد نہیں کہ یہ لوگ واقعی وہابی ہیں۔ اس لئے انہوں نے حلفیہ بیان دیا ہے، کہ یہ سُنّی ہیں [1]

"اصل مقدمہ پٹنہ میں دائر ہوا تھا، جس کی پیروی مسٹر انگرام (Ingram) نے کی۔ صرف ہبیس کورپس [2] (Habeas Corpus) کی سماعت کلکتہ میں ہوئی۔ مشہور بیرسٹر مسٹر انسٹی (Anstey) بمبئی سے کلکتہ لایا گیا۔ اور مقدمہ ۷ راگست ۱۸۷۱ء سے شروع ہو کر ۸ رستمبر کو ختم ہوا۔ مختلف وقفوں کے ساتھ مقدمے کی سماعت صرف نو روز رہی۔"

---

[1] جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۴ صفحہ ۳۷۵۔

[2] Habeas Corpus کے لفظی معنی (Have the body) کے ہیں اور توضیح یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو حکومت کی عاملہ یا پولیس وغیرہ خلافِ قانون قید یا حبس میں ڈال دے، تو اس شخص کو یا اس کی طرف سے ہر کسی شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ ہائی کورٹ کے کسی جج کے پاس جا کر درخواست کرے کہ فلاں شخص کو خلافِ قانون محبوس کر دیا گیا ہے۔ تو جج فریق ثانی کے نام حکم نامہ جاری کرے گا کہ وہ آ کر وضاحت بیان کرے کہ کیوں اس کے خلاف (Right of Habeas Corpous) (محبوس شخص کی آزادی کا حکم) جاری نہ کیا جائے؟ اور اگر حابس کوئی قانونی وجہ نہ بیان کر سکے، جو جج کی نگاہ میں جائز ہو، تو جج رہائی کا حکم دے دے گا۔ یعنی (Right of Habeas Corpous) جاری کر دے گا۔ مختصر طور پر یوں سمجھیے کہ (Habeas Corpus) ایک حق ہے جو (Law of the England) کے ماتحت تمام برطانوی رعایا کو حاصل ہے۔

امیر خان، عمر ۵۰ سال، جو کہ چمڑے کا تاجر تھا، ریگولیشن نمبر ۳، ۱۸۱۸ء کے ماتحت گرفتار کیا گیا تھا۔ اس نے حسب ذیل درخواست اپنے وکیل کے ذریعہ دی۔

"قیدی ملکہ کا ایک وفادار رعایا ہے۔ سالہا سال سے کلکتہ میں تجارت کرتا ہے۔ سینیچر، ۱۰ر جولائی ۱۸۶۹ء کو ایک بجے بغیر کسی قانونی (Lawful) وارنٹ کے اپنے جائے قیام کولوٹولا[1] سے گرفتار کیا گیا ------------- اسے بالکل خبر نہیں کہ کیوں اور کس کے حکم سے وہ گرفتار ہوا ہے۔ حالانکہ اس نے وجہ دریافت کی تھی۔ وہ اپنے گھر سے ہوڑہ (ای، آئی ریلوے اسٹیشن) لایا گیا۔ جو اس عدالت کے عدالتی اختیار سے باہر ہے۔ پھر وہ گیا (بہار) بھیجا گیا، جہاں وہ ۳۰ر اگست ۱۸۶۹ء تک رہا۔ پھر اُسے علی پور جیل (کلکتہ) منتقل کر دیا گیا۔"

دوسرے قیدی حشمداد خاں نے ۱۱ر مئی ۱۸۷۰ء کو لفٹیننٹ گورنر بنگال کی خدمت میں ایک میموریل پیش کیا، کہ اسے رہا کیا جائے یا جلد از جلد اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ لفٹیننٹ گورنر نے جواب دیا کہ نہ تو وہ رہا کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ مقدمہ ہی چلایا جا سکتا ہے، اور چونکہ وہ ریگولیشن نمبر III[2] کے ماتحت گرفتار کیا گیا ہے، اس لئے نہ تو یہ معمول ہے، اور نہ حکومت کی نظر میں ضروری ہے کہ اسے وارنٹ کی نقل فراہم کی جائے۔

---

[1] کلکتہ کا ایک آباد محلہ، جہاں زیادہ تر مسلمان تاجروں کی دوکانیں اور آڑھتیں ہیں۔

[2] اس غیر معمولی حربے (ریگولیشن نمبر III، ۱۸۱۸) کے جواز پر ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب کے پورے تین صفحے صرف کئے ہیں۔ یہ ریگولیشن موجودہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا پیش رو ہے۔ یہ صوبہ بنگال میں رائج تھا۔ اس کے مقابلے میں صوبہ مدراس میں ریگولیشن II، ۱۸۱۹ء اور بمبئی میں ریگولیشن VIII ۱۸۱۸ء رائج تھے، چونکہ اس وقت کوئی مرکزی مجلسِ قانون ساز نہیں تھی۔ اس لئے یہ ریگولیشن گورنر کے اختیارِ خاص سے جاری کئے جاتے تھے۔ ان سب کا مقصود وہی تھا، جو آج ڈیفنس ایکٹ کی غرض بتائی جاتی ہے یعنی حکومتِ وقت کے خلاف خلفشار کارروائیوں کو ختم کرنے کے لئے امنِ عامہ کا تحفظ۔

"امیر خان کے مقدمے کی پیروی پہلے مسٹر (Anesty) نے کی۔ پھر وہ بمبئی واپس چلا آیا، اس پر انگلش مین[1] نے یہ الزام لگایا کہ مسٹر (Anesty) فیس کی کمی کے باعث بددل ہو کر چلے گئے، جس کی انہوں نے تردید کی اور اس مقدمے کو "شرمناک[2]" بتایا۔"

آٹھویں دن جسٹس نارمن نے ایک لمبا فیصلہ سنایا، جو شواہد و اقتباسات سے بھرا تھا، جس کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا گیا تھا۔

"وجوہ مذکورۂ بالا کی بنیاد پر میری رائے یہ ہے کہ امیر خان کو بذاتِ خاص حاضر کرنے کے لئے ----- (Habeas Corpous) کا حکم نامہ (Writ) جاری کرنا (Issue) مناسب نہیں اور جو کاروائی ہوئی ہے۔ اس سے قانون Rule کا منشا پورا ہو جائے گا۔ جس کے تحت یہ کاروائی کی جارہی تھی۔

"اصل مقدمے کی پیروی مسٹر انگرام (Ingram) نے کی۔ یہ بڑا مشہور بیرسٹر تھا۔ اس کی آمدنی کا کم سے کم تخمینہ ایک لاکھ کیا جاتا ہے۔ پٹنہ سے کلکتہ انتقال کی درخواست دی گئی۔ لیکن ہائی کورٹ نے نامنظور کی۔ ایڈووکیٹ جنرل نے سپریم گورنمنٹ کی ہدایت کے بموجب انتقالِ مقدمہ کی سخت مخالفت کی۔"

---

[1] اس وقت کا مشہور نیم سرکاری اخبار۔

[2] (The shameful Cace miscalled Wahabi enquiry)

[3] مسٹر انگرام کے علاوہ مسٹر لنگھم (Lignam) اور مسٹر مندس (Mendes) بعض دوسرے ملزموں کی طرف سے پیروکار تھے۔ اور بعض ملزموں کی طرف سے کوئی وکیل نہیں تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ انبالہ (۱۸۶۴ء) سے لے کر پٹنہ (۱۸۷۱ء) تک دفاع کے تمام وکیل یورپین تھے۔

"یہ مقدمہ ذاتی نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ سرکاری حلقوں کا خیال یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح ان مجرموں کو سزا ہو جانی چاہیئے۔ اور یہ کلکتہ میں ناممکن تھا۔"

امیر خان پہلے پہل مقدمہ سازش انبالہ کے دوران میں گرفتار ہوئے۔ میجر پارسن، خاص طور پر انبالہ سے بھیجے گئے تھے۔ اور اسی نے خانہ تلاشی لی تھی۔ جرح کے جواب میں اس نے یہ اعتراف کیا کہ وارنٹ کے بغیر اس نے خانہ تلاشی لی تھی اور گرفتار کر کے مسٹر ریلی (Rely) کے گھر میں ایک شب رکھا پھر انہیں ہوڑہ بھیج دیا گیا۔

"مقدمہ" کی روداد سے متعلق دو چار باتیں اور مسٹر رہٹسک (Rehatsek) کی زبان سے بھی سن لیجئے۔

"امیر خان پہلے پہل ۱۸۶۴ء (رمضان ۱۲۸۰ھ مقدمہ انبالہ کے دوران میں) میں گرفتار کیا گیا۔ پھر ضمانت پر رہا کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ء (ربیع الاول ۱۲۸۶ھ) میں گرفتار ہوا۔ اور پہلی مئی ۱۸۷۱ء تک (جب کہ ان کا مقدمہ پٹنہ میں شروع ہوا) کسی قانونی وارنٹ کے بغیر، صرف گورنر جنرل کی مرضی پر قید رکھا گیا۔"

"مقدمہ مئی، جون، جولائی تین مہینے جاری رہا۔ شہادتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے متعلق بہت کم کہا گیا ہے، روپے کے معاملے میں امیر خان بہت فیاض معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے، کہ ان کا تعلق جہاد سے ثابت کیا جائے۔"

جولائی کے شروع میں حشمداد خان کو پٹنہ کے سیشن جج نے رہا کر دیا۔ اس لئے کہ ان کے خلاف الزام (Prima Facia Case) ثابت نہ ہو سکا۔ پیر محمد کو بھی رہا کر دیا گیا۔ جج کی رائے میں ان کے خلاف کافی شہادت نہ تھی۔

لہ وہابی ٹرائل: صفحہ ۲۵۔۲۴۔

"باقی پانچ آدمیوں (بشمول امیر خان) کو حبسِ دوام کی سزا ملی۔ اس معمر آدمی (امیر خان) نے اپیل کی، لیکن بے سود۔ آخر اتنی ترمیم ہوئی کہ انہیں ہندوستان ہی میں رکھا جائے۔ ۱۸۷۹ء میں رہا کئے گئے اور شاید رہائی کے ایک یا دو دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔[1]"

امیر خان کے مقدمے کی ساری اہمیت ان کی کروڑوں روپے کی جائداد کی وجہ سے تھی۔ آخر کیا بات ہے کہ انبالہ، پٹنہ، مالدہ اور راج محل کے مقدموں میں دو چار گواہوں سے سرکار کا کام چل گیا۔ مگر اس آخری مقدمے میں سرکار کو ملک کے طول و عرض سے ۱۴۳ گواہ بلانا پڑے۔ اس پر بھی خود ایک انگریز مبصر کی زبان میں "ملزموں کے خلاف گواہوں نے بہت کم کہا۔"[2]

وہ بیچارے کہتے ہیں، انہیں تو رٹی ہوئی داستان سنانا تھی۔ ۱۸۷۱ء کے مقدمے کی پوری روداد ہمارے سامنے ہے۔ راقم نے اس کا حرف حرف بار بار پڑھا ہے۔ امیر خان کے "جرم" کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ مقدمے کی روداد سے ان کا جرم مشتبہ ہو جاتا ہے۔ ہاں! تو جیسا کہ راقم نے عرض کیا، حکومت امیر خاں کی جائداد ضبط کرنا چاہتی تھی اور وہ اس نے کر کے دکھا دیا ——— بعد کو "ضعیفی" کے باعث انہیں رہا کر دیا گیا۔ مگر جائداد کا ایک حبہ واپس نہیں ملا۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری لکھتے ہیں:۔

"——— اپنے معمولی پرانے گواہوں سے جو چاہا، گواہی دلوا کر بیچاروں کو کالے پانی کو روانہ کیا اور امیر خان کی چند کروڑ کی جائداد سے اپنا کل خرچہ پورا کر لیا اگرچہ اس

---

[1] ان میں سے اکثر گواہوں کو کافی انعامات بھی دئے گئے (ملاحظہ ہو:۔ قاضی میاں جان مقدمۂ انبالہ) کے بھائی قاضی مراد کی شہادت (گواہِ انبالہ، پٹنہ، مالدہ، راج محل) (وہابی ٹرائل: ص ۲۶)

[2] جنرل رائل ایشیاٹک، بمبئی، رہٹسک کا مقالہ۔

امیر خاں کو باوجود دائم الحبس کے چار برس[1] بعد گورنمنٹ نے مفت کا احسان رکھ کے چھوڑ دیا اور ایک حبہ جائدادِ منضبطہ سے واپس نہ دیا۔ اگر چار برس پہلے الزام سے بری ہو کر چھوٹ جاتا۔ تو اپنی کروڑوں کی جائدادِ منضبط بھی سرکار سے واپس لے لیتا۔۔۔۔۔"[2]

اس مقدمے کے دوران میں پولیس نے کیا کیا بے عنوانیاں کیں اور کس کس طرح بے گناہوں کو تنگ کیا، اس کا ہلکا سا اندازہ مسٹر پرنسپ (H. T. Princip) سیشن جج پٹنہ (۱۸۷۱ء) کے مندرجہ ذیل ریمارک سے ہوگا۔ مقدمۂ انبالہ کی تفتیش کے سلسلے میں میجر پارسن، ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس انبالہ، کلکتہ تشریف لائے تھے اور ان کے مشورے سے امیر خاں کو گرفتار کر کے مسٹر ریلی پولیس افسر کلکتہ کے گھر میں رکھا گیا۔ پھر چند مہینوں کے بعد انہیں چھوڑ دیا گیا اور کاغذات واپس کئے گئے ———— یہ ساری کاروائی من مانی تھی۔ اس پر سیشن جج، پٹنہ کا ریمارک ملاحظہ ہو:۔

"مصاحب علی (امیر خاں کا ملازم) اور امیر خاں خانہ تلاشی کے بعد رات کو مسٹر ریلی کے گھر لے جائے گئے ۔۔۔۔۔۔ امیر خاں سے ضمانت لی گئی اور باقی اسی شام کو میجر پارسن کے ساتھ انبالہ بھیجے گئے ———— بہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر ریلی کے گھر پر چند مہینے حاضر رہنے کے بعد امیر خاں کو چھوڑ دیا گیا اور ان کے خطوط و کاغذات جو مسٹر ریلی کے ہاتھ سے آگے نہیں بڑھے، واپس کئے گئے۔ میں ان کاروائیوں کا ذکر کر رہا ہوں اس لئے کہ یہ سب بالکل غیر قانونی تھیں، اور گو موجودہ مقدمے پر ان کا فوری اثر نہیں پڑتا، ان کا نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اگر ہندوستان میں سراغ رسانی کی پولیس رکھنا مطلوب

---

[1] (Rehatsek) ۱۸۶۹ء میں رہائی کا ذکر کرتا ہے۔ گویا سزایابی کے آٹھ برس بعد۔ رسالۂ اشاعت السنۃ (جلد ۵ نمبر ۱۲) میں رہائی کی تاریخ ۱۸۶۸ء دی گئی ہے۔

[2] تواریخ عجیب: ص۱۲۸

ہے، تو اس کے افسروں کو پولیس افسروں کے عام قانون سے اپنے کو برتر نہیں سمجھنا چاہیئے اور بہت ممکن ہے کہ ان معاملات میں بے لگام آزادی اختیارات کے غلط اور ناروا استعمال پر منتج ہو۔[1][2]"

بعض دوسرے گرفتارانِ بلا

اوپر سازش کے پانچ مقدموں کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ صرف یہی حضرات قید و محن میں مبتلا کئے گئے۔ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۷۱ء تک گرفتاریوں کا سلسلہ برابر جاری رہا بڑی تعداد کچھ "لے دے کر" چھوڑ دی گئی۔ کچھ بے قانون اور بے سزا حوالات اور جیلوں میں سڑتے رہے۔ ایک اچھی خاصی جماعت وعدہ معاف گواہ بننے پر مجبور کی گئی۔ ۱۸۷۱ء کے مقدمے کی "رُوداد" پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ الٰہی بخش (برادرِ حقیقی میر مقصود علی امیر المجاہدین ف ۱۲۷۶ھ) قاضی مراد (برادرِ حقیقی قاضی میاں جان متہم سازش انبالہ) الٰہی بخش، محمد شفیع، عبدالکریم (سزا یافتگانِ انبالہ) عبداللہ قواعدی (جو مجاہدین کو قواعد سکھانے پر مامور تھا)

---

[1] ایک طرف پولیس افسروں کی یہ زیادتیاں ہیں۔ دوسری جانب سرکار کی ان پر خاص نوازش کا بھی حال سن لیجیئے۔ ایشری پرشاد، پولیس انسپکٹر، پٹنہ (۱۸۶۴ء) جس نے انبالہ (۱۸۶۴ء) پٹنہ (۱۸۶۵ء) کے مقدموں میں کارہائے نمایاں انجام دئے اور اسیرانِ بلا کو دوبارہ "پھانسنے" کے لئے اس نے انڈمان تک سفر کیا) کی ترقی کی سفارش خود راونشا نے اپنی یادداشت (دفعہ ۳۳) میں کی تھی۔ جو قبول ہوئی اور غالباً انہیں ڈپٹی کلکٹر بنایا گیا۔ نیز لفٹنٹ گورنر بنگال بہادر نے مزید ڈھائی ہزار کے نقد انعام کی سفارش کی (مراسلہ مسٹر (A. Eden) سکرٹری گورنمنٹ بنگال بنام کمشنر پٹنہ ڈویژن مورخہ ۲۶ر جولائی ۱۸۶۸ء)۔

[2] وہابی ٹرائل: ص۱۶۶

قاری امداد علی (ایک ممتاز جہادی کارکن) اور ان جیسے بیسیوں دوسرے آزمودہ کار کارکنوں کی "گواہیاں" پڑھ کر عبرت ہوتی ہے اور ان بیچاروں پر ترس آتا ہے۔ اللہ جانے، کن کن دھمکیوں اور سختیوں کے بعد یہ غریب اس "گناہ" پر تیار ہوئے ہوں گے! لغزش تو بہر حال لغزش ہے۔ مگر ـ ـ ـ ـ ـ بعض ایسے موقعے آتے ہیں، کہ مجرم، پر غصے کے بدلے ترس آتا ہے۔ یہی حال راقم کا ان غریبوں کے ساتھ ہے۔ جانے۔ اُن حالات میں ہم ہوتے، تو کیا کرتے؟؟

ہاں! تو عرض یہ کر رہا تھا کہ گرفتاران بلا ان مقدموں کے اشتہاری مجرموں میں محدود نہیں۔ مثال کے طور پر مسعود خان ساکن بوگرا (بنگال) کو لیجئے، یہ ۱۸۶۸ء میں گرفتار ہوئے اور ۱۸۸۳ء[1] میں مولانا عبدالرحیم (ف ۱۳۴۱ھ) وغیرہ کے ساتھ رہا ہوئے۔ مگر ان کی گرفتاری اور مقدمے کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

ان کے علاوہ ان سینکڑوں بلکہ ہزاروں بے گناہوں کے مصائب کا اندازہ کرنے کیلئے، جو خلافِ قانون جیلوں میں ڈال دیئے گئے تھے، ہنٹر کا یہ بیان ملاحظہ کیجئے:۔

"اس وقت (یعنی ۱۸۷۱ء میں) بنگال جیل میں ایک سفید ریش مسلمان ہے۔ جس کی زندگی ہر طرح پاک ہے، لیکن وہ انتہا پسند باغی ہے۔ تیس سال سے اس کی بغاوت کا حال معلوم

---

[1] آخر میں صرف چھ ملزم جزائر انڈمان میں رہ گئے تھے۔ مولانا یحیٰی علی (ف ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۸ء) اور مولانا احمد اللہ (ف ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء) دونوں بھائی تو وہیں خوابِ استراحت میں مصروف ہیں۔ قاضی میاں جان انبالہ ہی میں وفات پاگئے (۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ)، ۱۸۸۳ء/۱۳۰۰ھ میں لارڈ رپن (۱۸۸۰ - ۱۸۸۴) وائسرائے ہند کے حکم سے جو لوگ رہا ہو کر وطن لوٹے، ان کے نام یہ ہیں (i) مولانا عبدالرحیم (متہم مقدمۂ انبالہ: ف ۱۳۴۱ھ) (ii) مولوی محمد جعفر تھانیسری (متہم مقدمۂ انبالہ ف ۱۹۰۵ء) (iii) میاں عبدالغفار (متہم مقدمۂ انبالہ: تقریباً ف ۱۳۲۳ھ) (iv) مولوی امیر الدین (متہم مقدمۂ مالدہ) (v) مولوی مبارک علی (متہم مقدمۂ پٹنہ: ف تقریباً ۱۳۱۷ھ) (vi) مسعود خاں ساکن بوگرا (بنگال) اسیر ۱۸۶۸ء)

تھا اور وہ بھی جانتا تھا کہ اس کا حال چھپا ہوا نہیں۔ ۱۸۴۹ء میں اسے باضابطہ دھمکی دی گئی۔ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۵۷ء میں اس کا اعادہ کیا گیا۔ ۱۸۶۴ء میں اسے مجسٹریٹ کی عدالت میں آخری طور پر نصیحت کے لئے بلایا گیا۔ اس نے ان تمام تنبیہوں کا ذرہ برابر خیال نہ کیا۔ آخر ۱۸۶۹ء میں وہ ذاتی حراست Personal restraint میں رکھا گیا۔ ایسے مقدمات کو نبٹانا بہت مشکل ہے۔ اپنے عقیدے کے مطابق متقی اور مخلص لوگوں کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے حکومت خود گھبراتی ہے۔ کم از کم یہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا زہر دوسروں تک نہ پہنچنے پائے۔ اور وہ بھی صرف معمولی پابندی کے ساتھ۔" ــــــــــ

ایسی مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں۔ پر جگہ اور وقت کی تنگی قلم روکنے پر مجبور کرتی ہے،

اسیرانِ بلا کے مصائب اور اُن کی استقامت

مجاہدین میں سے جو جامِ شہادت سے سیراب ہوئے، وہ دین و دنیا دونوں میں اچھے رہے۔ آخرت میں ان کے مرتبے کا حال تو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، پر ایک دنیا دار کی مادّی نگاہیں بھی اتنا دیکھتی ہیں کہ وہ ایک غیر الٰہی نظامِ حکومت کے ناخدا ترس عُمّال کے جور و ظلم سے بچ گئے۔ جہادِ سرحد کے شہیدِ اوّل[1] باقر علی عظیم آبادی سے لے کر ان لاتعداد اور گمنام شہیدوں تک جو مختلف حملوں اور خونی معرکوں میں سفاک دشمن کے مشقِ ستم کا نشانہ بنے، سب نے

---

[1] دیکھو سیرتِ سیّد احمد شہیدؒ: صفحہ ۱۴۷، طبع دوم، یہ حضرت سیّد شہیدؒ کے مرید اور مولانا ولایت علیؒ صادق پوری کے چچازاد بھائی تھے۔ سیرتِ سیّد احمد شہید (صفحہ ۳۸۷) کے لائق مصنف نے سیّد صاحبؒ کے خلفا میں ان کا نام دیا ہے۔ خلافت کے متعلق تو قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا، البتہ اتنا واقعہ ہے کہ یہ مولانا ولایت علی (ف [illegible]ھ) کے چچازاد بھائی تھے اور مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی (ف ۱۲۷۴ھ) مولانا فرحت حسین (ف [illegible]ھ) اور مولوی قمر الدّین شہید (بالاکوٹ: ۱۲۴۶ھ) وغیرہم کے ہمراہ حضرت سیّد صاحبؒ سے بیعت ہو چکے تھے جب سرحد پر سکھوں سے جنگ شروع ہوئی تو سب سے پہلے اللہ کا جو بندہ اس کی راہ میں کام آیا وہ یہی باقر علی عظیم آبادی تھے۔ رحمہ اللہ ونوّر ضریحہٗ۔

اپنا اپنا حق ادا کیا اور اللہ نے چاہا، تو وہ رضائے الٰہی سے سرفراز ہو چکے ہوں گے۔ مگر ان ہزاروں بے گناہوں کے غم و آلام کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے، جو طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہوئے قسم قسم کی اذیتیں برداشت کیں اور پھر آزمائش میں کامیاب اترے، یعنی ان کے قدم ہر منزل پر لغزش سے نا آشنا اور سینے نورِ ایمان سے روشن رہے اور ان کے دل جذبۂ فدویت سے کبھی خالی نہیں ہوئے ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ان مجاہدینِ راہِ حق کی داستان درد بہت طویل ہے اور دردانگیز بھی۔ قیدیوں اور جلاوطنوں کی روداد الم پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کبھی موقع ملا تو جی کڑا کر کے یہ ساری رودادِ الم سنا دی جائے گی۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اب سننے سنانے کا وقت گزر چکا۔ وقت کی تیز رفتاری اپنے عال پر ہے۔ اس کی فطرت انتظار کرنا نہیں جانتی۔ موقع عمل کا ہے۔ وقت آگیا ہے۔ کہ پھر از سرِ نو اس رسمِ کہن کو زندہ کیا جائے۔

عمر یست کہ آوازۂ منصور کہن شد   من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

مگر جب داستان چھڑ گئی ہے تو پھر چند بکھرے ہوئے اوراق نذرِ ناظرین ہیں۔ خوش قسمتی سے اس راہ کے دو مسافر اپنی رودادِ سفر کا ایک حصّہ ہماری عبرت و بصیرت کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔

ہماری مراد مولوی عبدالرحیم صاحب صادق پوری کی تذکرۂ صادقہ اور مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری کی تواریخِ عجیب سے ہے۔ سرِ دست ہم انہیں کتابوں سے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں، جس سے ان مصائب کی ہلکی سی جھلک معلوم ہو گی، جو ان شیفتگانِ راہِ صداقت پر توڑے گئے۔ ان دونوں صاحبوں نے جزائرِ انڈمان سے واپسی (۱۸۸۳ء / ۱۳۰۰ھ) کے بعد یہ کتابیں لکھی ہیں، اس لئے قدرتی طور پر وہ اپنے اصلی خیالات

و ناثرات[1] نہ ظاہر کر سکے ہوں گے۔ پھر بھی ضمنی طور پر ان بزرگوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے نشانِ راہ کا پتہ لگتا ہے اور مجاہدین کی مصیبتوں کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔

مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم اور ان کے رفقا پہلے انبالہ جیل میں رکھے گئے، جہاں ان کا مقدمہ ایک عرصہ تک چلتا رہا، وہاں ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوا وہ مولوی عبدالرحیمؒ صاحب کی زبانی سنیئے:۔

"ــــــ ہر ایک علیحدہ علیحدہ ایک کوٹھری میں کہ جس کو سنگین کوٹھری کہتے ہیں، بند کر دئیے گئے۔ وہ کوٹھری پانچ فٹ لمبی اور چار فٹ چوڑی ہو گی۔ اور چھت اس کی نہایت بلند اور اوپر چھت کے ایک چھوٹا سا روشن دان تھا کہ آدمی اس میں سانس لے سکے، نہایت تنگ و تاریک تھی۔ اس کوٹھری میں تقریباً ڈھائی تین مہینے ہم لوگ رہے۔ جملہ گیارہ آدمی تھے۔ شب و روز میں ایک بار اس کا دروازہ کھلتا اور ایک جمعدار اور تین سپاہی اور ان کے ساتھ ایک باورچی کہ جس کے ہاتھ میں روٹیاں اور دال ہوتیں اور ایک سقہ کہ جس کے مشک میں پانی ہوتا اور ایک بھنگی ہاتھ میں گملا لئے ہوئے آتا۔ اور ہر ایک کوٹھری کو کھولتا۔ باورچی

---

[1] ڈاکٹر محمود حسین خان لکچرار ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایک مختصر مضمون "ہندوستانی وہابیوں کی سیاست" ـــــــــــــــ مارننگ نیوز، کلکتہ کے عید نمبر ۱۹۴۴ء / ۱۳۶۳ھ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری کو ان لوگوں میں شمار کیا ہے، جو یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ "سید صاحبؒ کو انگریزوں سے مطلق پرخاش نہیں تھی اور مسلمانوں کو اس حکومت سے کوئی شکایت نہیں"، مولوی محمد جعفر صاحبؒ اور مولوی عبدالرحیم صاحبؒ دونوں نے اس طرح کی باتیں ضرور لکھی ہیں۔ مگر ان کی کتابوں کا پڑھنے والا یہ محسوس کر لیتا ہے کہ "فلاں بات کیوں کہی گئی ہے؟" اور "بین السطور" سے تو تمام باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ڈاکٹر محمود حسین خان اس "پس منظر" سے ناواقفیت کے باعث یہ رائے قائم کرنے میں "معذور" کہے جا سکتے ہیں۔

دو روٹیاں اور کچھ دال دیتا اور سقہ ایک کوزہ پانی دیتا اور بھنگی گملا صاف کر دیتا اور پھر یہ لوگ چلے جاتے۔ جو جو تکلیفیں اس میں گزریں، اس کا بیان طول ہے اور فضول۔ بعد تین مہینے کے جب مقدمہ ہم لوگوں کا اجلاس میں صاحب مجسٹریٹ کے شروع ہوا۔ اس وقت ہم گیارہ آدمی قبروں سے نکال کر ایک مکان حوالات میں جمع کر دئیے گئے جو اسی جیل خانہ میں تھا۔ بعد تین مہینے کے ہم لوگوں نے آسمان کی صورت دیکھی اور ایک کی دوسرے سے ملاقات ہوئی از حد خوشی حاصل ہوئی۔"[1]

آج کل تو قید خانوں میں سیاسی ملزموں کے لئے درجے، مقرر ہیں۔ تیسرے درجے میں بھی سیاسی قیدیوں کے ساتھ حیوانوں کا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ لیکن اِن علماء مجاہدین کو جیل میں پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ اللہ کے بندے انبالہ جیل میں گھاس پتوں پر گزارہ کرنے پر مجبور ہوئے۔

اس قدر بھوک کا غلبہ سب لوگوں کو رہتا کہ دو دو روٹیاں سرکار سے ملتیں۔ ان کے کھانے سے یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟ جیل میں جس قدر گھاس تھی۔ مع بیخ اُکھاڑ کر قیدی لوگ چٹ کر گئے۔ ہر طرف سے 'الجوع الجوع' ہائے بھوک کا شور تھا۔[2]

انبالہ میں سزا یابی کے بعد اسیرانِ بلا لاہور جیل کو منتقل کئے گئے، مگر کس شان سے؟ مولوی محمد جعفر صاحب لکھتے ہیں:۔

۲۲ فروری ۱۸۶۵ء کو ہم جیل لاہور کو روانہ ہوئے۔ گیروا لباس جوگیانہ صورت،

---

[1] تذکرۂ صادقہ: صہ ۶۸ - ۶۷

(The Politics of the Indian Wahhabis)

[2] صہ ۷۳

کمبل اوڑھے ہوئے بیڑی ہتھکڑی کے زیور سے آراستہ پیراستہ ہم منزل در منزل کوچ درکوچ چلے جاتے تھے۔ دو ایک گاڑیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ بقدر تیس چالیس قیدیوں کے ہم جیل انبالہ سے روانہ ہوئے تھے۔ سب پاپیادہ چلتے تھے۔ جب کوئی تھک جاتا تو اس کو گاڑی پر بھی سوار کر لیتے تھے۔ ورنہ پاپیادہ خلخال آہنی کو چھن چھناتے چلے جاتے۔۔۔۔۔"[1]

لاہور پہنچ کر گرفتاران الم کی مصیبتوں میں اور اضافہ ہو گیا:۔

قریب تین بجے شام کے ہم لوگ سنٹرل جیل لاہور کے دروازہ پر پہنچے اور ہمارے چالان کے کل قیدی ایک قطار کر کے دروازہ جیل پر بٹھلا دئیے گئے۔ اوّل ایک کشمیری ہندو داروغہ آیا۔ اس نے پہلے ہمارے مقدمے والوں کو بغور تمام دیکھا اور کسی قدر افسوس بھی کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر گرے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل رونق افروز ہوئے۔ انہوں نے سب سے اوّل ہم لوگوں کا ملاحظہ کیا اور بڑے غصّہ سے حکم دیا کہ ایک آڑا ڈنڈا بھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ چنانچہ بمجرّد صدور اس حکم کے لوہار ڈنڈے آہنی لے کر حاضر ہو گئے۔ اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کڑوں کے درمیان سے ایک ایک آڑا ڈنڈا جو ایک فٹ سے زیادہ لمبا نہ تھا۔ ڈال دیا گیا۔ یہ حکم ازراہِ تعصّب فقط ہم ہی لوگوں کے واسطے تھا، اور تمام جیل گھر میں ہم نے کسی قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا نہیں دیکھا۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی محال تھا،،[2]

یہ تو لاہور جیل کا عطیّہ تھا۔ انڈمان جاتے ہوئے، ملتان اور کراچی کے درمیان ایک اور زنجیر کا اضافہ ہوا:۔

"اور سوا بیڑی اور ہتھکڑی اور ڈنڈے کے، جو پہلے سے سب زیب تن تھے، یہاں ایک بڑی موٹی زنجیر آہنی بھی ہماری بیڑیوں کے بیچ میں سے پہنائی گئی، جس سے

---

[1] تواریخ عجیب: ص ۴۹ [2] تواریخ عجیب: ص ۵۰

اپنی اپنی جگہ سے کوئی ہل نہ سکتا تھا۔ جب تک ہم جہاز پر رہے، اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے پاخانہ پیشاب کرتے رہے۔ اس وقت قریب آدھا آدھا من کے لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ باوجود اس قدر کثرت پانی کے کہ دریائے سندھ ہمارے زیر پا تھا۔ ہم پڑے پڑے تیمّم سے نماز پڑھتے تھے۔،، [1]

ان مظالم کے علاوہ مقدّمہ کے دوران میں گرفتارانِ بلا اور ثابت قدم گواہوں پر جو سختیاں کی گئیں، وہ بیان سے باہر ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دو واقعے لکھے جاتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔لیکن اکثر گواہ گواہی دیتے وقت بھی ہمارے منہ کو دیکھ کر زار زار روتے بھی جاتے تھے، مگر بے بس۔ اگر گواہی نہ دیویں، تو قطع نظر مار پیٹ کے پھانسی کا سامنا تھا۔۔۔۔۔۔۔اور مار پیٹ کی تو یہ حالت تھی کہ عباس نام ایک لڑکا جو مدّت تک میرے گھر میں رہ کر پرورش پایا تھا۔ جب مجسٹریٹی میں گواہی دیتے وقت مجھ کو دیکھ کر مارے محبّت کے جھوٹا اور آموختہ بیان میرے اوپر کرنے سے ہچکچایا، تو اسی روز رات کو اس کو ایسی سخت سزا کی گئی کہ وہ بچہ اسی صدمہ سے قبل از در پیشی مقدّمہ سیشن کے مرگیا۔۔۔۔" [2]

یہ تو پیشی کے دوران کے مظالم تھے۔ مقدّمے کی پیشی سے پہلے بعض بزرگوں پر جو ناروا مصیبتیں روا رکھی گئیں، ان کے سُننے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔ مولوی محمّد جعفر صاحب اپنی آپ بیتی لکھتے ہیں۔ پڑھئے اور اپنا ایمان تازہ کیجئے۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔دوسرے دن فجر کے وقت پارسن صاحب۔۔۔۔۔آئے اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدّمہ کا سب حال بتلا دو۔ تمہارے واسطے بہت بہتر ہوگا۔۔۔۔۔۔ پارسن صاحب نے مجھ کو پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا بھی شروع کیا۔ جب میری مار حد کو پہنچی اور میں گر پڑا۔۔۔۔۔۔۔اور جب اس قدر مار پر بھی میں نے کچھ نہ بتلایا۔ تو وہ سب کے

---

[1] تواریخِ عجیب : صفحہ ۵۳

[2] تواریخِ عجیب : صفحہ ۳۵

سب مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں نے جب یہ کیفیتِ ظلم اور تعدّی کی دیکھی، تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب مجھ کو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمّہ کچھ روزے رمضان کے باقی تھے۔ دوسرے دن سے ان کی قضا رکھنی شروع کر دی۔ اس کے بعد پارسن صاحب انہیں ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے گئے اور وہاں فہمائش سے مایوس ہو کر انہوں نے اپنی آخری حسرت بھی نکال لینا چاہی۔"

"------- میں نے اس چاپلوسی پر بھی انکار کیا۔ تو پھر پارسن صاحب ----- مجھ کو ایک الگ کمرے میں لے گئے۔ جہاں لے جا کر پھر مارنا شروع کیا۔ میں کہاں تک لکھوں؟ آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو۔ لیکن بفضلِ الٰہی میں سب سہار گیا۔ مگر اپنے ربّ سے ہر دم یہ دُعا کرتا جاتا تھا کہ اے ربّ یہی وقتِ امتحان کا ہے، تو مجھ کو ثابت قدم رکھیو------" (ص۸)

یہ صبر آزما حالات تھے، جن میں ان مردانِ خدا نے استقامت و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور یہی تکلیفیں تھیں، جن سے گھبرا کر محمد شفیع، الٰہی بخش وغیرہ بعد کو سرکاری گواہ بن گئے، مگر ان سب میں ایک اللہ کا بندہ ایسا تھا، جو سب سے ممتاز تھا۔ اس کی استقامت میں صحابہ کرامؓ کا رنگ جھلکتا تھا۔ اس کی للّٰہیت، جاں سپاری اور فدویت "عبدیت" کے اس مقام تک پہنچ گئی تھی، جس کا تصور بھی اس دور میں مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

میری مراد مولانا یحییٰ علیؒ جعفری صادق پوری سے ہے۔ یہ سیّد صاحبؒ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے حالات پڑھ کر حضرت خُبَیبؓ، حسین بن علی (رضی اللہ عنہ) اور احمد بن حنبلؒ (ف ۲۴۱ھ) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا۔ اپنے امیر مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کی معیّت کبھی نہ چھوڑی۔ سفر، حضر میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گلاب سنگھ سے جو لڑائیاں ہوئیں، ان میں بھی آپ شریک تھے۔ دوسری مرتبہ بھی سفر ماورائے سرحد میں آپ ساتھ رہے ——— پھر نظمِ جماعت کا کام آپ نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ مولانا عنایت علیؒ (ف ۱۲۷۴ھ) مولانا فرحت حسینؒ (ف ۱۲۷۴ھ) اور شاہ محمد حسین صاحبؒ (ف ۱۲۷۶ھ)

خلفائے سید شہیدؒ کے پے درپے وفات کی وجہ سے تنظیم و تبلیغ کا سارا بار آپ کے کندھوں پر پڑ گیا، جسے آپ حیرت انگیز قابلیت اور معاملہ فہمی کے ساتھ اپنی گرفتاری کے وقت (۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء) تک چلاتے رہے۔ جیل اور قید میں بھی آپ کا رنگ سب سے الگ تھا۔ تکلیفیں اوروں نے بھی برداشت کیں، پر حسین ابن علیؓ اور احمد بن حنبلؒ کا مقام ہی اور ہے۔ تیرہویں صدی ہجری کے احمد بن حنبلؒ، مولانا یحییٰ علیؒ کے صبر و استقامت کا حال سُنئے۔

"ہمارے حضرت مولانا کا صبر و استقلال اس وقت کا قابلِ دید تھا۔ شب کو میں اور آپ ایک ہی جگہ رہتے۔ آپ پچھلی شب حسبِ معمول نماز، دُعا وغیرہ میں مشغول رہتے۔ اور اکثر اشعارِ عاشقانہ، دیوان شاہ نیاز و حافظ وغیرہ کا پڑھتے اور ایک نہایت وجدی کیفیت آپ پر طاری ہوتی۔ ہم لوگ سب ہوش باختہ ہوتے اور آپ نہایت مسرور و خوش۔ آپ کے چہرہ و بشرہ سے کچھ بھی آثار رنج و محن کے پائے نہ جاتے۔ ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے۔ آپ اکثر اس شعر سے بھی جو حضرت خُبیب صحابی رضی اللہ عنہ کا ہے، مترنم ہوتے:-

وَلَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ فِی اللّٰہِ مَصْرَعِیْ

وَذٰلِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَّشَاءَ یُبَارِکْ عَلٰی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعٖ

[جب میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جاؤں، تو مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ اللہ کی راہ میں کس پہلو میری جان نکلتی ہے۔ یہ سب اللہ کی راہ میں ہے، وہ چاہے تو بوسیدہ (ٹکڑے ٹکڑے) جسم کے اعضا میں برکت اور بالیدگی دے۔]

میرے پاس [illegible] الفاظ [illegible] ہیں کہ [illegible] سے آپ کی اس کیفیتِ وجدی و صبر و شکر کا ایک کرشمہ بھی بیان کر سکوں۔ اس کی تصویر کھینچ کر ہدیۂ ناظرین کرنا تو محال ہے۔[1]"

ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ معمولی اس لحاظ سے کہ سب اسیرانِ بلا صبر و شکر کے ساتھ

---

[1] تذکرہ صادقہ صفحہ :

برداشت کر گئے۔ مگر ایک عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اس کا کچھ اور ہی اثر ہوا۔ جب انبالہ میں پھانسی کی سزا حبسِ دوام سے بدل دی گئی اور ان مشتاقانِ شہادت کو حکومت نے بزعمِ خود "محروم" رکھنا چاہا تو ان کو عام قیدیوں کے ساتھ کر دیا گیا اور لباس وغیرہ میں تبدیلی کے ساتھ داڑھیاں بھی کتر دی گئیں۔ اس کا مولانا پر جو اثر ہوا، اس کا حال سنیئے اور سینوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے ایمان کا جائزہ لیجیئے۔

"۱۶ ستمبر (۱۸۶۴ء) کو ڈپٹی کمشنر صاحب پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی پڑنے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو۔ اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہتی سزا تم کو نہیں دیوے گی۔ تمہاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدلی گئی۔ مجسٹریٹ نے اس حکم کے پھانسی گھروں سے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بارکوں میں ملا دیا۔ اور جیل خانہ کے دستور کے موافق مقراض سے ہماری داڑھی، مونچھ اور سر کے بال تراش کر منڈی بھیڑ سا بنا دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ مولوی یحییٰ علی صاحب اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اٹھا اٹھا کر کہتے کہ افسوس نہ کر کہ تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اس کے واسطے کتری گئی۔[1]"

مولاناؒ کا صبر و استقلال ہر منزل اور ہر قدم پر یکساں تھا۔ پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔ قیدِ تنہائی سے سرفراز ہیں۔ مگر سنتِ یوسفی سے غافل نہیں۔ جب بھی موقع ملتا ہے اللہ کا پیغام پہنچانے سے باز نہیں آتے۔

"۔۔۔۔۔ چنانچہ ہمارے حضرت اس قیدِ تنہائی میں پھر تخمیناً دو ڈھائی مہینے رہے اور نہایت صبر و استقلال کے ساتھ ان ایام کو آپ نے بسر کیا اور جب کوئی سپاہی پہرے والا یا اور کوئی سپاہی یا قیدی آپ کے سامنے آجاتا، ہندو یا مسلمان، سب کو آپ

---

[1] تواریخِ عجیب: صہ ۴۴

وعیدِ باری کا وعظ سناتے اور عذابِ آخرت و قبر وغیرہ سے ڈراتے ۔۔۔۔ سپاہی جو
پہرے کے واسطے آتا وہ سکھ ہوتا یا گورکھا اور مسلمان نہ ہوتا تو آپ اس آیتِ کریمہ کا
لفظ سناتے ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ[1] سپاہی کھڑا
رہتا اور جب اس کے پہرے کی بدلی ہوتی، تو اس صحبت کو چھوڑ کر جانا پسند نہ کرتا میں
نہیں لکھ سکتا کہ کس قدر فائدہ اس وقت پہرے والوں کو پہنچا اور کتنے موحد ہو گئے۔
اور کتنے دینِ آبائی کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے لَا يَعْلَمُهٗ اِلَّا اللّٰهُ آپ کا جسم مبارک
قیدی تھا، مگر آپ کے دل و زبان آزاد تھے۔ اس پر کسی کی حکومت نہ تھی بجز اس حاکمِ حقیقی
کے۔ اگر دو منٹ کے واسطے بھی کوئی آدمی سامنے آجاتا، آپ امر بالمعروف و نہی عن المنکر
بجا لاتے[2]

ابھی آپ داڑھی کتروانے کا حال پڑھ چکے ہیں۔ اب تشدد اور مشقت پر بھی ذرا
اس "مردِ مومن" کی استقامت کا حال سنئے:۔

"صبح کو کپتان ٹائی صاحب مجسٹریٹ و ڈپٹی کمشنر انبالہ و پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ
جیل میں آئے اور داروغہ کو حکم دیا کہ مولانا سے سخت تر مشقت لی جاوے۔ چنانچہ
داروغہ نے اپنے روبرو کھڑے ہو کر ایک بڑے کنوئیں پر جو رہٹ چل رہا تھا، عین تمازت
آفتاب میں اس رہٹ کو آٹھ دس قیدی چلا رہے تھے۔ آپ کو بھی اس میں دے دیا۔ آپ
تین روز تک تمام روز اس کو چلاتے رہے۔ آپ کو بباعثِ حرارتِ آفتاب خون کا پیشاب
آنے لگا۔ آپ نہایت صبر و شکر سے اس کو انجام دیتے رہے ۔۔۔۔۔۔[3]"

بعد میں جب جیل کا ڈاکٹر آیا، تو اس نے داروغہ جیل کو از خود تنبیہ کی۔ اور مولانا
ایک دوسرے ہلکے کام پر لگایا گیا۔

---

[1] یوسف ع۵۔ متفرق معبود اچھے یا ایک معبودِ برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا؟
[2] تذکرہ صادقہ صہ۱ [3] صہ۲

اس کے بعد امتحان کا ایک دوسرا موقع آتا ہے۔ حکومت مولانا یحییٰ علیؒ کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہؒ (ف در انڈمان ۱۲۹۸ھ) پر مقدمہ چلانا چاہتی ہے۔ انبالہ کے سزا یافتوں کو طرح طرح سے ورغلایا جا رہا ہے۔ محمد شفیع، عبدالکریم اور الٰہی بخش کے قدم ڈگمگا چکے ہیں۔ طرح طرح کی ترغیبیں دی جا رہی ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔ وہ عجیب وقت تھا کہ ادھر تو ہم لوگ انواع و اقسام کے آلام و مصائب میں مبتلا اور پھر عذابُ الجوع، اور ادھر وہ راحت و آرام و تنعّم، گویا نمونۂ قیامت تھا کہ ایک طرف جنت اور دوسری طرف دوزخ نظروں کے سامنے رکھی تھی۔ وہ وقت پرلے سرے کی جانچ اور امتحان کا تھا۔ اس وقت پر آیۂ کریمہ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا کا مضمون خوب صادق آتا ہے ۔۔۔۔۔ ہر ذی ایمان رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ کہتا تھا۔ ہمارے حضرات باطمینانِ قلب نہایت خنداں و شاداں و فرحاں یادِ الٰہی میں اور لوگوں کو استقامت دلانے میں شب و روز مصروف رہتے۔ دنیائے دوں کی بے ثباتی اور اس کی راحت و آرام کی بے قراری اور ثوابِ آخرت اور جنتِ نعیم کی پائداری یاد دلاتے اور رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ کو خوب کھول کھول کر بیان فرماتے ۔۔۔۔ [۱]"

داستان طویل ہوتی جاتی ہے اور سخنہائے گفتنی کی کوئی حد نہیں۔ خامہ کار قلم حیران ہے، کیا چھوڑے اور کیا لکھے؟ ۔۔۔۔۔ بہرحال مولاناؒ کے صبر و شکر کی ایک اور مثال پیش کر کے یہ سلسلہ ختم کرتا ہوں۔

۱۸۶۵ء میں جب صادق پور کے مسکونہ مکانات اور قبریں تک کھود کر پھینک دی گئیں۔ تو اس وقت اچھوں اچھوں کے قدم لڑکھڑا گئے تھے اور اسیرانِ بلا کے لئے بھی صبر و ضبط کا قائم رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ مولانا یحییٰ علیؒ کو اس "حادثے" کی خبر وہیں جزائر

---

[۱] تذکرہ صادقہ ص ۱۴۳:

انہدام میں ملتی ہے اور صبر و شکر کے ساتھ اپنی اہلیہ اور اہلِ خاندان کو صبر و ضبط کی تلقین کرتے ہیں۔ مولانا رحمہ اللہ کے مکتوب کے اقتباسات پڑھیے اور کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر سوچیے کہ ایسے میں ہمارا کیا حال ہوتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یحییٰ علی کی طرف سے بخدمت علیہ اُمّ محمد یوسف[1] سلمہا اللہ تعالیٰ

ـــــ ضروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نورِ چشم محمد حسن[2] مُدّ عمرہٗ کے حال انہدام دونوں مکانوں کا معلوم ہوا۔ البتہ دل کو قلق ہوا اور صدمہ بہت گزرا، کیونکہ مکان سکونتِ قدیم سے خصوصاً وہ مکان کہ جس میں ذکر اللہ بہت ہوا ہو اور کاروبار فریضہ بہت اجرا پائے ہوں، مومنین کو انس و محبت بطور اہل و عیال کے ہوتی ہے۔ اسی روز شب کو زیارت روحِ انور سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشرف ہوا، تبسم کناں فرمانے لگے۔

کہ البتہ انہدام سے مکانوں کے مالکانِ مکان کو خصوصاً نسواں کو رنج و الم بہت ہوا ہے اور ہونے کی جگہ ہے اور ان آیاتِ کریمہ کو زبان مبارک سے ارشاد فرمایا۔

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ[3] ○ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ○ عَسَىٰ رَبُّنَا أَن

---

[1] شمس العلماء مولانا محمد یوسف صاحب رنجور عظیم آبادی (ف ۱۳۴۱ھ) خلف مولانا یحییٰ علی رحمہ اللہ۔

[2] شمس العلماء محمد حسن صاحب ذبیح (ف ۱۳۰۸ھ) خلف مولانا ولایت علی رحمہ اللہ (ف ۱۲۶۹ھ)

[3] البقرۃ: ۱۵۲ - ۱۵۱۔ پھر جو لوگ ایسے ہیں کہ صبر کرنے والے ہیں، تو انہیں (فتح و کامرانی کی) بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی کوئی مصیبت ان پر آ پڑتی ہے تو ان کی زبانِ حال کی صدا یہ ہوتی ہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و کرم ہیں اور جو اس کی رحمت کا مورد ہوتے ہیں اور یہی ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔

(ترجمان القرآن)

یُبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَا، اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ ؀[۲] اور فرمایا کہ ان آیاتِ کریمہ کو وردِ زبان رکھو۔ عبادت خانے اور مسجدِ اقصیٰ اور مکاناتِ انبیاء علیہم السّلام بخت نصر اور جالوت کے ہاتھ سے انہدام پائے تھے۔ آخر منہدم کرنے والے نسیًا منسیًّا ہوئے۔ اور یہ اماکنِ متبرکہ از سرِ نو بنا ہوئے اور پہلے سے زیادہ آباد ہوئے۔ تم بھی اپنے رب کے فضل سے ایسی ہی امید رکھو ۔۔۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ دشمنانِ خدا اس کے دوستوں کو اچھی طرح ستائیں۔ بعد اس کے اچھی طرح بدلہ پاویں ۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھیرے ۔۔۔۔۔"

۔۔۔۔۔۔۔ بعد از فراغ اس مکاشفہ کے میں نے بہت انشراح و تسکین پایا۔ اور اپنے بڑے بھائی (مولانا احمد اللہؒ) کو آگاہ کیا ؎

دریائے عشقِ خالق دونوں جہاں میں ہم — نام و نشان دارِ فنا کے ڈوبا چکے
کفنی گلے میں ڈال کے، تسمہ کمر کے بیچ — ہم جوگی ہوئے محرمِ اسرار کے لئے
اے خدائے من فدایت جانِ من — جملہ فرزندانِ جان و مانِ من" الخ

اقتباس از مکتوب مؤرخہ ۲۱ رجمادی الاولیٰ
روز یکشنبہ (۱۲۸۳) ۱۸۶۶ء

---

[۲] اے ہمارے پروردگار، ہمیں صبر کی نعمت سے شاد کام فرما اور ہمیں اسلام کی حالت میں اس دنیا سے اٹھا۔ شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس کا اچھا بدلہ دے ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

آٹھواں باب

ظاہری ناکامی کے اسباب

کامیابی یا ناکامی؟

سیّد شہیدؒ، ان کے اصحاب خاص اور ان کی جماعت کے کارنامے پڑھ کر ذہن میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تحریک ناکام کیوں ہوئی؟ اور جب ایسی جماعت جو اپنی سیرت اور کردار کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ کی سیرت و کردار کا نمونہ تھی، ناکام رہی، تو پھر کسی دوسری جماعت کی کامیابی اور منزل مقصود تک پہنچنے کا کیا امکان ہے؟ یہ سوال پیدا ہونا طبعی بات ہے اور راقم سے اچھے اچھے اصحابِ علم نے یہ سوال کیا ہے کہ سیّد صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ کی ناکامی کے بعد اس راہ پر قدم بڑھانے کی جرأت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ "حکومت علیٰ منہاج النبوۃ، کا نام لینا آسان ہے، مگر کرنا مشکل"[1] انہوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ "اب اللہ کی سرزمین پر اس کا نام سربلند ہو ہی نہیں سکتا۔"[2] اب اسلام، کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ کسی دوسری چلتی ہوئی تحریک کا ضمیمہ بن کر رہے ناکامی کے اسی غیر اسلامی تصور نے ہمارے بعض مشہور اہل فکر

---

[1]، [2] یہ فرضی اقوال نہیں، بلکہ اسلامی ہند کی ممتاز ترین شخصیتوں کی رائیں ہیں۔ نام لینا مناسب نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

کو مسلمانوں کی تقدیر (Destiny) ہی سے مایوس کر دیا ہے۔ بعض دلوں میں مایوسی تجربہ اور استقراء کا چولا بدل کر کہتی ہے کہ یہ قوم اب عقیم ہو چکی ہے۔

ایک خطاکار ناآشنائے راہ و رسمِ منزل، جب بزرگوں کی زبان سے یہ باتیں سنتا ہے، تو حیرت ہوتی ہے۔ اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق صورتِ حال کو سمجھنے اور اس پیچیدہ گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

(ا) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہماری کامیابی اور ناکامی کا تصوّر دنیا کے عام تصورات سے بالکل الگ ہے۔ ہم اس خاکدانِ ارضی میں 'عبد' بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے آقا اور مولا کی رضا مندی، اس کے احکام کی بجا آوری اور اس کا کلمہ بلند کرنے کی کوشش میں لگے رہیں۔ مقصود کو پالینا ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام کوشش کرنا اور ذہنی و جسمانی قوتوں کو حرکت میں لاتے رہنا ہے۔ منزل تک پہنچانا اس کا کام ہے۔ جس نے ہمیں اپنی اطاعت اور فرماں برداری کے لئے دنیا میں غلام بنا کر بھیجا ہے۔ اس لئے ایک مومنِ قانت کے دل میں دنیوی کامیابی و ناکامی کا سوال پیدا ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے مولا کی رضا میں لگے رہنا سو کامیابیوں کی ایک کامیابی ہے۔

(اا) دوسری چیز قابلِ غور یہ ہے کہ کیا یہ تحریک بالکل ناکام رہی ہ؟ کیا شاہ ولی اللہؒ (ف ۱۱۷۶ھ) اور ان سے پہلے اسلامی ہند کی جو دینی حالت تھی، اس میں "شہیدین" اور ان کے اصحابِ باصفا کی کوششوں اور فداکاریوں سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوا؟ کیا آج بھی بیوہ عورتوں کا نکاحِ ثانی اسی طرح معیوب و مذموم سمجھا جاتا ہے؟ کیا آج بھی بڑے بڑے علمی خانوادوں اور علمائے دین کے گھروں میں 'السّلام علیکم کے بدلے' آداب عرض کرتا ہے۔ کی صدا بلند ہوتی ہے؟ کیا آج بھی خواص اور اہلِ علم و عمل طبقوں میں اجمیر اور دیوہ کی زیارت 'حج' کے برابر سمجھی جاتی ہے؟ اور کیا سوڈیڑھ سو برس سے آج تک مسلسل 'مردانِ کار' کا ایک گروہ (خواہ کتنا ہی مختصر سہی) اللہ کے نام پر گھر بار لٹاتا نہیں رہا ہے؟ کیا آج بھی شرک

و بدعات کی گرم بازاری کا وہی حال ہے ؟ اور کیا "شہیدین" سے پہلے بھی برملا طریقے پر حکومت الٰہیہ اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی صدائے عام سننے میں آئی تھی ؟ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اگر ان سب کا جواب اثبات میں ہے، تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ناکامی کسے کہتے ہیں، اور اگر ان کا نام "ناکامی" ہے، تو ایسی "ناکامی" پر ہماری ہزاروں کامیابیاں قربان ـــــــ کہنا یہ ہے کہ حضرت سید شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے اصحاب خاص کی تحریک دعوت وجہاد سے "بحر ہند" کی ساکن سطح میں جو تموج پیدا ہوا اس کی لہریں آجتک باقی ہیں اور "بزم آرائیاں" ساحل کو دریا کی موجوں سے ہم آغوش ہونے کی برابر دعوت دے رہی ہیں۔ اگر اس تحریک سے دیگر ہزاروں فیوض و برکات کے علاوہ صرف یہی ایک فائدہ ہوا ہوتا، تو بھی اسے ناکام نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اور یہاں تو یہ حال ہے کہ موجودہ اسلامی زندگی کے جتنے روشن اور خوش منظر گوشے نظر آتے ہیں، سب کے سب اسی تحریک کے فیض سے مستفیض اور اسی کی روشنی سے اجاگر ہوئے ہیں۔

(۱۱۱) لیکن ہمیں اسی قدر پر قناعت نہیں کرنا ہے، بلکہ کمر ہمت کو چست باندھ کر محمل کو آگے بڑھانا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کی ظاہری اور دنیوی کامیابی کی راہ میں جو دشواریاں رکاوٹ ثابت ہوں، ان سے دامن بچا کر سفر شروع کیا جائے۔ نیز اس تحریک کے علم برداروں سے جو مسامحتیں یا فروگذاشتیں ہوئی ہیں، ان کا جائزہ لیا جائے اور آنے والوں یا ساتھ چلنے والوں کو ان سے آگاہ کر دیا جائے۔ ممکن ہے، اس سے خوش عقیدہ لوگوں کو کچھ تکلیف بھی ہو، لیکن اگر اس ساری داستان سرائی سے مقصود محض "پدرم سلطان بود" کا آموختہ پڑھنا نہیں ہے، تو پھر مستقبل کی کامیابی کے لئے ماضی کی کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کا بے لاگ جائزہ لینا ضروری ہے۔

(الف) سب سے پہلی چیز جو سید صاحبؒ اور ان کے ساتھیوں کی تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوتی ہے، وہ یہ کہ انہوں نے جس علاقے (ہندوستان کا سرحدی صوبہ اور ماورائے سرحد

کا علاقہ) کو اپنا میدانِ عمل اور سرگرمیوں کا مرکز بنایا، وہاں کے باشندوں کی تعلیم و تربیت کا انہوں نے پیشتر سے کوئی انتظام نہیں کیا۔ فوری تبلیغ و ترغیب سے بعض قبیلے ہم نوا ہوئے مگر جونہی موقع ملا، دھوکہ دینے میں انہیں ذرا بھی جھجک نہیں پیدا ہوئی۔ اور جب فتح پشاور کے بعد اسلامی قانون نافذ کیا گیا، تو ان کی قبائلی عصبیت اور رچی بسی ہوئی جاہلیت بھڑک اٹھی جس کے نتیجے میں مجاہدین کا قتلِ عام ہوا اور جیتی ہوئی لڑائی شکست سے بدل گئی۔ قانونِ اسلامی کے نفاذ کیلئے مسلمان رعایا بھی مطلوب ہے۔ فاشستی یا نازی آمریت کے نمونے پر الٰہی قانون پر عمل درآمد نہیں کرایا جا سکتا۔ اس کے لئے رعایا اور عام آبادی کی طرف سے تعاون اور لبیک شرط ہے۔ مزید براں یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ اسلامی حکومت کی رعایا ایک دن میں نہیں بنتی۔ اس کے لئے مدتِ دراز تک دعوت و تبلیغ اور اس سلسلے میں اذیتوں کا برداشت کرنا ناگزیر ہے۔ خود حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس تدریج کا مکمل نمونہ موجود ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ پشاور کے قتلِ عام اور خوانین کی غداری کے بعد بھی مجاہدین کو اپنی اس غلطی کا احساس نہیں ہوا اور وہ سالہا سال تک اسی[1] علاقے کو اپنی فدا کاریوں کا مرکز بنائے رہے، حالانکہ انہیں ہر دور میں اور ہر لڑائی میں قبائل نے دھوکے دئے۔ مولانا عنایت اللہ غازی رح (ف ۱۸۵۸ء / ۱۲۷۴ھ) مولانا عبداللہ رح (ف ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) ہر ایک کو اس قسم کے دھچکے لگتے رہے، مگر انہوں نے ان علاقوں کو نہ چھوڑا اور نہ ان قبائل کی باضابطہ اسلامی تربیت کی طرف توجہ کی۔ بہت ممکن ہے کہ مولانا ولایت علی رح (ف ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء) کے بعد اسلامی انقلاب کا صحیح تصور

---

[1] پشاور کے قتلِ عام کے بعد سیّد صاحب رح پنجتار کو چھوڑ کر راج دواری میں چلے گئے اور خوانین کے اظہارِ پشیمانی کے باوجود اس مرکز سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ جہاں چار سال صرف کر چکے تھے۔ لیکن یہ تمام علاقہ کم و بیش یکساں تھا۔ عوام کی کوئی تربیت نہیں ہوئی تھی۔ فوری جوش یا مالِ غنیمت اور دنیوی جاہ و حشم کی طمع میں وہ ساتھ دیا کرتے تھے۔

بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا ہو۔

قبائل کی مسلسل غداریوں کے باوجود ان علاقوں میں "مجاہدین مرابطین" کے جمع رہنے کی ایک وجہ اور سمجھ میں آتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مقدمۂ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء/۱۲۸۰ھ تک اہلِ صادق پور اصحابِ قافلہ (ٹونک) اور عام مجاہدین و معتقدین پر سید صاحبؒ کی شہادت کا مسئلہ واضح نہیں ہوا تھا اور وہ شمال مغربی پہاڑیوں سے سید شہید کے دوبارہ ظہور کی توقع رکھتے تھے۔ ممکن ہے، خوانین و قبائل کی غداری کے باوجود ان پہاڑی علاقوں میں جمع رہنے پر اس خیال کا بھی دخل ہو۔ یہ راقم کی ذاتی رائے ہے، جس پر اصرار نہیں۔

(ب) دوسری اہم چیز جو اس دعوت اور اس کے ماننے والوں کی سیرت میں کھٹکتی ہے، وہ ان کا امیر کی ذات میں غلو ہے اور عجیب تر بات یہ ہے کہ مولانا اسماعیل شہیدؒ جیسے عالم اور مجاہد بھی حضرت سید شہیدؒ کے متعلق ایسے القاب[1] و الفاظ استعمال کرتے ہیں، کہ پڑھ کر خیال ہوتا ہے، کہیں کسی معصوم کی توصیف تو نہیں بیان کی جا رہی ہے؟ شخصیت میں غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ہی "غیبوبت" کا شاخسانہ کھڑا ہوگیا اور اس میں بڑے بڑے عالموں اور مجاہدوں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ مولانا ولایت علیؒ، مولانا یحییٰ علیؒ اور بیسیوں متبعِ سنت عالم اس عقیدے کے قائل ہوگئے تھے۔ مولانا یحییٰ علیؒ (جو اپنی استقامت اور

---

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ صراطِ مستقیم:۔ اما بعد می گوید۔۔۔ بندۂ ضعیف محمد اسمٰعیل کہ نعمِ الٰہی درباره این ضعیف نامتناہی است و ازا عاظمِ آں حضورِ محفلِ ہدایت منزلِ ملازمان فخرِ خاندان سیادت مرجع اسبابِ ہدایت مرکزِ دائرہ ولایت دلیلِ سبیلِ فلاح و رشاد، رہنمائے طریقِ استقامت و سداد، مظہرِ انوارِ نبوی، منبعِ آثارِ مصطفوی، سلالۂ خاندانِ مطلب طاہر۔۔۔ مقتدائے اصحابِ شریعت، پیشوائے اربابِ طریقت، ہادیِ زمانہ، مرشدِ یگانہ، سراجُ المتقین، تاجُ المحبوبین الامام الاوحد السید احمد متع اللہ المسلمین بطول بقائہ ونفعنا وسائر الطالبین باقوالہ واحوالہ الخ۔

عمل کے لحاظ سے امام احمد بن حنبلؒ کا نمونہ تھے) غالباً آخر تک سید صاحبؒ کی غیبوبت کے قائل رہے۔ مشہور ہے کہ پھانسی گھر میں وہ درد کے یہ شعر بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے۔

انشا پیغام درد کا کہنا | جب صبا کوئے یار میں گذرے
کون سی رات آپ آئیں گے | دن بہت انتظار میں گذرے

نیز ان کے اس تاریخی مکتوب میں جو انہوں نے جزائرِ انڈمان سے مکاناتِ مسکونہ کے انہدام کی خبر سن کر لکھا تھا (جس کا ایک ٹکڑا اوپر درج کیا جا چکا ہے) یہ فقرے بھی ملتے ہیں۔

--------- زیارتِ ارواحِ متبرکہ سے حضرت علی مرتضٰی و حسنین رضی اللہ عنہم کے بیں مشرف ہوا۔ حضراتِ ثلاثہ کو بہت منور دیکھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میر انشاء اللہ خاں کو کہدو کہ تو بھی میری اولاد سے ہے۔ اور مہدی جو واسطے ادفاعِ منافقینِ ملاعنہ کے کوہستانِ خراساں میں موجود ہے ------- عنقریب نکلے گا۔ اور قلع قمع منافقینِ ملاعنہ کا کرے گا۔

مولوی جعفر صاحب تھانیسری کی سوانحِ احمدی، کے دیباچے میں بھی، مہدیؑ وسط کا لفظ آتا ہے، گو ذرا احتیاط کے ساتھ۔ رسالہ اربعین فی المھدیین میں بھی اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ خواہ مخواہ ذہن سید صاحبؒ کی مہدویت کی طرف منتقل ہو۔

یہ سب غلو اور حد سے بڑھی ہوئی عقیدت کا نتیجہ تھا۔ اسلام میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کی ذات معصوم نہیں۔ امامِ دار الہجرۃ سیدنا مالک بن انس (ف ۱۷۹ھ) نے سچ کہا ہے:۔

كُلُّ وَاحِدٍ يُؤْخَذُ مِنْهُ وَيُرَدُّ عَلَيْهِ اِلَّا صَاحِبُ هٰذَا الْقَبْرِ صلی اللہ علیہ وسلم

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر شخص کے اقوال میں ردّ و قبول کی گنجائش ہے۔

(ج) تیسری نمایاں چیز جو اس پہلی اسلامی تحریک کے علم برداروں میں کھٹکتی ہے۔ وہ ان کا متصوفانہ اندازِ بیان اور طریقِ عمل ہے۔ حاشا کہ راقم کو تصوف کی روح اور جوہر

سے انکار نہیں اور حضرت مجددؒ الف ثانی (ف ۱۰۳۴ھ) اور شاہ ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ)
جیسے بزرگوں نے 'تصوف' کے نام سے جو چیز پیش کی، گو وہ اپنی روح اور جوہر کے لحاظ سے
اسلامی 'احسان' سے الگ نہیں تھی لیکن انہوں نے اظہارِ مطالب کے لئے جو زبان اور اصطلاح
اختیار کی وہ وہی تھی جس کے ذریعہ عرصۂ دراز سے تصوفِ باطل کی ترویج ہو رہی تھی۔ حضرت
مجددؒ نے تو ابنِ عربیؒ (ف ۶۳۸ھ) کے گمراہ کن نظریوں پر سخت ضرب بھی لگائی، مگر شاہ صاحبؒ
نے مجددؒ صاحب اور ابنِ عربیؒ کے نظریوں کے درمیان تطبیق دے کر عقیدۂ وحدتِ الوجود کو
سندِ جواز عطا کر دی۔ حضرت سید شہیدؒ کے رفیقِ خاص مولانا شہیدؒ نے البتہ امام ابنِ تیمیہؒ
(ف ۷۲۸ھ) کی طرح ٹھیٹھ توحیدی طریقہ اختیار کیا۔ عبقات میں تو وہ اپنے دادا کے رنگ پر
معلوم ہوتے ہیں۔ مگر صراطِ مستقیم میں سید صاحبؒ کا رنگ جھلکتا ہے اور وہ وحدت الوجود
سے بیزار نظر آتے ہیں۔ مگر خود سید صاحبؒ کی ذات کے ساتھ کرامات اور خرقِ عادات اور مکاشفات
کا اتنا بڑا سلسلہ وابستہ کر دیا گیا، کہ شہیدینؒ کی شہادت کے بعد ہی یہ جماعت اندھی عقیدت
کا شکار ہو گئی۔ کچھ تو عقیدۂ غیبوبت کے قائل ہو گئے اور گاہے گاہے انہیں سید صاحبؒ کا
سلام بھی پہنچنے لگا اور پیری مریدی سے تو بہت کم لوگ بچ سکے، بدعات سے نفرت، اہلِ
حدیثیت اور جذبۂ جہاد کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مراقبہ ہوتا۔ "توجہ" دی جاتی۔ مکاشفات
بیان کئے جاتے اور[1] "کشفِ قبور" وغیرہ میں مہارت پیدا کی جاتی ——— نتیجہ معلوم

---

[1] مولانا عبدالرحیم صاحب (ف ۱۳۴۱ھ) مولانا یحییٰ علی (ف ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۸ء) کے حال میں لکھتے ہیں: "... فیضِ باطنی بھی علیٰ وجہ الاتم آپ نے پایا۔ آپ کے مراقبے کی یہ کیفیت تھی کہ جب کبھی آپ چادر اوڑھ کر بیٹھ جاتے۔ فی الفور آپ کو مراقبہ کھل جاتا۔ انبیاء و اولیاء کی زیارت ہوتی۔ ان سے گفتگو ہوتی۔ ان سے حلِ مطالب فرماتے۔ کشفِ قبور میں بھی آپ کو ملکۂ تام تھا ..." (تذکرہ صادقہ: ص ۶۳)

پھر دوسری جگہ اپنے والد ماجد مولانا فرحت حسین (ف ۱۲۷۴ھ) کے حال میں رقم طراز ہیں۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۸ پر ملاحظہ ہو)

متبعینِ سنّت اور مجاہدوں کے ماننے والوں میں بھی "بہ مے سجادہ رنگین کن، گرت پیرِ مغاں گوید" کا انداز پیدا ہوگیا ـــــــ تمام اسلامی دنیا اور خاص کر ہندوستان میں تصوّف کے موجودہ قالب نے دین اور دینی تحریکوں کو اتنا نقصان پہنچایا ہے، کہ اب صرف اس لئے بھی یہ قالب قابلِ ترک ہوگیا ہے۔ تورّع، زہد، عبادات، تہجّد گزاری، اللہ کی یاد ـــــــ کسی چیز سے انکار نہیں، یہ چیزیں محمود تھیں اور ہمیشہ محمود رہیں گی۔ مگر پیری مریدی کا یہ غیر ماثور طریقہ اب قطعی طور پر قابلِ ترک ہوگیا ہے۔ اور یہ طریقہ تو تزکیہ کے ذریعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب یہ چیز واضح ہو چکی کہ یہ طریقہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں، تو پھر اس کے ترک کرنے میں کونسی چیز مانع ہے؟

(د) ایک آخری بات اس باب میں اور قابلِ غور ہے۔ سیّد شہیدؒ اور ان کے اصحابِ خاص نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق اسلامی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی، اور ان کا طریقۂ کار اس زمانے کے لحاظ سے ایک حد تک ٹھیک بھی تھا، مگر اب کہ حالات بدل چکے ہیں، لکیر کا فقیر بنا رہنا مناسب نہیں۔ کتاب و سنّت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت سے نئے حالات اور نئے مقتضیات کے مطابق مکمّل اسلامی انقلاب و تجدید کا خاکہ بنا کر گامزن ہونا چاہیئے۔ اب صرف قتال یا صرف عبادت و زُہد کی روح کا بیدار کرنا کافی نہیں۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں جاہلیت کے مقابلے کی تیاری کرنا چاہیئے آج کفر کے حملے کسی ایک مورچے پر محدود نہیں۔ ہر آنے والی سانس کفر کے جراثیم سینوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۷) "جناب مولانا یحییٰ علی علیہ الرحمۃ کو جب کہ آپ ملک افغانستان میں تھے، بعد انتقال بڑے حضرت کے (مولانا ولایت علی: ف ۱۲۶۹ھ) مراقبہ میں مشاہدہ بازی و زیارت انبیاء و اولیاء بزرگانِ دین بند ہوگیا۔ جب آپ وہاں سے پٹنہ تشریف لائے، جناب چھوٹے حضرت نے ان کو بٹھا کر توجّہ دی تب مراقبہ میں مشاہدہ و زیارت وغیرہ حسبِ دستور جاری ہوگیا۔ (صہ ۱۴۳)

داخل کر رہی ہے۔ فضا آلودہ اور زہریلی گیسوں سے مسموم ہے۔ اس کے مقابلے کے لئے مکمل اور ہر جہتی پروگرام کی ضرورت ہے۔ نمرود کی آگ آج ہر کوچہ و بازار میں بھڑک رہی ہے لیکن اولادِ ابراہیم علیہ السلام کو شاید اس کی خبر بھی نہیں۔ طاغوتی قوتوں کا پرچم کوہ و دشت، ویرانہ اور آبادی، ہر جگہ لہرا رہا ہے۔ کون ہے، اللہ کا بندہ جو بڑھ کر حق اور ایمان باللہ کا علم بلند کرے؟

———— ہر طرف سے ھَل مِنْ مُّبَارِزٍ؟ ھَل مِنْ مُّجِیبٍ؟ کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کون ہے، جو لبیک کہے؟

۱. صراطِ مستقیم: مولانا اسماعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ)

۲. اجازت نامے: صادق پور سے سید صاحبؒ کے بعض ایسے اجازت نامے دستیاب ہوئے جو اب تک کہیں طبع نہیں ہوئے، اور جن سے سید شہیدؒ کی تعلیم اور طریقِ تزکیہ پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

۳. مخزنِ احمدی: (قلمی)، مصنفہ مولوی سید محمد علی صاحب (ف ۱۲۶۶ھ) خواہرزادہ و خلیفہ حضرت سید شہیدؒ (مخطوطہ اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ ۱۳۸۵ھ)

۴. حالات مولوی عنایت علی یا اعلام نامہ: (قلمی) یہ ایک اپیل ہے، جو مجاہدین مقیم سرحد نے مسلمانانِ ہند کے نام بھیجی تھی، مؤرخہ ۱۲۶۲ھ کاتب کا نام امام علی درج ہے۔ (مخطوطہ کتاب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد)

۵. اتحاف النبلاء: نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ) محدثین و فقہاء کے تذکرے میں مشہور کتاب ہے۔ اس میں مولانا شہیدؒ اور اس سلسلے کے بعض دوسرے حضرات کے حالات بھی درج ہیں۔

۶. مثنوی شہر آشوب: حکیم عبدالحمید عظیم آبادی (ف ۱۳۱۲ھ)

۷. الاقتصاد فی مسائل الجہاد: مصنفہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی (ف ۱۳۳۹ھ) اس رسالے میں جہاد کو منسوخ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مطبوعہ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء۔ اردو

انگریزی، عربی میں اس کے ترجمے بھی شائع ہوئے اور انگریزی اور اردو ترجمے سر چارلس ایچیسن[1] اور سر جیمس لائل گورنران پنجاب کے نام معنون کئے گئے۔

اس مضمون کی تالیف ۱۲۹۳ھ میں ہوئی۔ علماءِ عصر سے رائے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں رسالہ اشاعت السنہ میں شائع کیا گیا (جلد ۲ نمبر ۱ ضمیمہ) پھر مزید مشورہ و تحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ میں باضابطہ کتابی صورت میں اس کی اشاعت ہوئی۔

اللہ مرحوم کی مغفرت کرے۔ اس کتاب پر انعام سے بھی سرفراز ہوئے تھے جماعت اہلِ حدیث کو فرقہ کی شکل دینے میں ان کا حصہ ہے اور یہی وہ بزرگ ہیں، جنہوں نے اس سادہ لوح فرقے میں وفاداری کی نیو پیدا کی۔ نہ صرف یہ، بلکہ دوسرے معاصر علماء کو سرکار کی مخالفت کے طعنے بھی دیئے۔

---
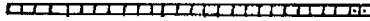
[1] حتی الوسع کتابوں کے نام تاریخی ترتیب سے دیئے گئے ہیں۔ اردو اور انگریزی ماخذ میں بھی یہی ترتیب ملحوظ ہے۔

اُردو : ۲

رسائلِ تسعہ : از مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ) اسی مجموعے میں رسالۂ دعوت اور رسالۂ اربعین بھی ہیں۔ رسالۂ دعوت میں صاف صاف عقیدۂ غیبوبت کا اظہار ہے۔ اور رسالۂ اربعین میں خروجِ مہدی کے متعلق چالیس حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں۔ مگر سید صاحب کا نام کہیں نہیں لیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ مولوی الٰہی بخش صاحب بڑاکری عظیم آبادی (ف ۱۳۳۴ھ) کے اُردو ترجمے کے ساتھ چھپا ہے۔

ترجمانِ وہابیہ : نواب صدیق حسن خان صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) اس میں بدنام وہابیوں کے متعلق طرح طرح کی "دلچسپ" باتیں کہی گئی ہیں۔ جو اصلیت سے دور ہیں۔

القاء المنن بالقاءِ المحن : نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ)

تواریخِ عجیب (طبع دوم) مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری (ف ۱۹۰۵ء) مصنف سید صاحبؒ کی جماعت سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ غالباً انہیں مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) سے بیعت تھی۔ ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء کے مقدمۂ سازش انبالہ میں ماخوذ ہوئے اور حبسِ دوام کی سزا ملی۔ اور جزائر انڈمان بھیجے گئے۔ ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء میں لارڈ رپن (۱۸۸۰ - ۱۸۸۴) کے حکم سے رہا ہوئے۔ واپسی کے بعد یہ کتاب لکھی۔ نام تاریخی ہے۔ ۱۳۰۲ھ یہ کالا پانی کے نام سے بھی مشہور ہے اس میں مصنف نے مقدمہ کی روداد اور ابتلاء و آزمائش کی سرگزشت، جہاں تک ممکن ہوسکا ہے، قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے

سوانح احمدی : (مطبوعہ صوفی کمپنی) مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری اس میں حضرت سید صاحبؒ کے حالاتِ زندگی، جہاد اور تعلیمات کا خلاصہ درج ہے۔ مشہور خلفاء کا بھی تذکرہ ہے نیز آخیر میں سید صاحبؒ کے مکتوبات بھی دے دئے گئے ہیں۔ یہ اُردو زبان میں سید شہیدؒ

کی سب سے پہلی مرتب سیرت ہے۔ تواریخ عجیب کے پانچ سال بعد لکھی گئی تاریخی نام تواریخ عجیبہ[1] ہے۔

تذکرہ صادقہ: (طبع دوم) مولانا عبدالرحیم صادق پوری (ف ۱۳۴۱ھ) مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ) کے بھتیجے اور مولانا فرحت حسینؒ (ف ۱۲۷۴ھ) کے صاحبزادے اور اخیر دور میں خاندانِ صادق پور کے گوہر شب چراغ تھے۔ ۱۸۶۴ء کے مقدمہ سازش میں ماخوذ ہوئے، حبسِ دوام بعبور دریائے شور سے نوازے گئے۔ ۱۸۸۳ء میں رہا ہوئے۔ رہائی کے بعد بھی چالیس برس سے زیادہ حیات پائی۔ یہ کتاب نہایت پریشان کن حالت میں لکھی گئی اور الہ آباد میں چھپی۔ معلومات بہت قیمتی ہیں، مگر بکھرے ہوئے۔ جابجا ایسے اشارات ہیں کہ اچھے واقف کار کے سوا کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ راقم کو حسنِ اتفاق سے صادق پور (عظیم آباد) کے ایک صاحبِ علم کا ذاتی نسخہ مستعار مل گیا، جس میں انہوں نے "بین السطوری" اشارات کی توضیح و تشریح نیز بعض نئے معلومات کا اضافہ کیا تھا۔ اس سے بہت مدد ملی اور خاص کر" غیروں" کے مبالغہ آمیز بیانات کی جانچ پرکھ میں ان "حواشی" نے بہت کام دیا۔

رسالہ اشاعت السنۃ: مرتبہ مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) افسوس کہ اس رسالے کا مکمل فائل نہیں دستیاب ہو سکا۔ ورنہ مفید معلومات ملتیں۔

ارمغانِ احباب: مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء (ف ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء) نے اپنے علمی سفر کی روداد قلم بند کی ہے (۱۳۱۲ھ) اس میں جماعت کے متعلق مفید معلومات

---

[1] مولوی محمد جعفر صاحب نے ایک کتاب تاریخ عجیب بھی لکھی تھی۔ جس میں صرف جزائر انڈمان کے جغرافی حالات سے بحث کی گئی تھی۔ راقم کی نظر سے نہیں گزری۔ یہ ایک باخبر صاحبِ علم کی روایت ہے۔ راد نشانے ان کے روزنامچہ نصائح جعفری کا ذکر کیا ہے۔ ڈائری کا آغاز روز سہ شنبہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ سے ہوتا ہے یعنی مقدمہ انبالہ سے دو برس پہلے۔ اس کتاب کا اور کسی دوسرے ذریعہ سے پتہ نہیں چلا۔

ملتے ہیں۔ (معارف :۔ فروری، جون ۱۹۳۹ء)

تذکرہ : مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ کی مشہور اور لازوال تصنیف۔

تراجم علمائے حدیث ہند : ابو یحییٰ محمد امام خان نوشہروی۔

سیرت سید احمد شہید : (طبع دوم) مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی۔

انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ : عبداللہ یوسف علی۔

ولی اللہ نمبر (الفرقان) : مرتبہ :۔ مولانا محمد منظور نعمانی۔

تجدید و احیائے دین : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک : مولانا عبیداللہ سندھیؒ (ف ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء)

مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر : مسعود عالم ندوی۔

محمد بن عبدالوہاب : ایک مظلوم اور بدنام مصلح : مسعود عالم ندوی (معارف، مئی، جون ۱۹۴۱ء)

وہابیت : ایک دینی اور سیاسی تحریک " " " (الہلال، مئی، جون ۱۹۳۶ء)

شاہ اسماعیل شہید : مجموعہ مقالات اُردو مرتبہ :۔ عبداللہ بٹ

1. A History of the Sikhs

Joseph Davey Cunnin gham. I London. 1949

2. Correspondence connected with emoval of W. Taylor from the commissionership of Patna Calcutta, 1858.

3. A general Report on the Yusfzais
H. W. Bellow. Lahore 1864

4. memorandum
by T. E. Ravenshaw
and the judgements of Mr. W. Ainslie, the session judge, Patna and of the High Court.(Calcutta Gazette's Supplement dated the 20th September. 1865)

5. Nine Years on the North West Frontier of India
Cotton London 1868.

6. The Indian Mussalmans
---W W. Hunter.
نیا ایڈیشن کلکتہ

7. The wahabie. Trial at Patna. 1871
سرکاری رپورٹ سن طباعت درج نہیں۔

8. The Wahabis in India
--James Okinealy. (Calcutta Review, 1870-71)

9. Sir Saiyid on Dr. Hunter's. Our Indian Mussalmans. London. 1872.

10. Notes on Muhammadnism
T. P. Plughes, London 1877

11. The History of the Wahhabys in Arabia and in India E. Rehatsek (J. R. A. S. Bo.) Vol.
IV. 1880

12. Thirty-Eight Years in India.
--William Taylor. London. 1882.

13. History of the Punjab.
Sayyid Mohammad Latif, Calcutta. 1891.

14. Befigal under the Lieutenant Governers
--G. E. Backland. Calcutta 1901.

15. Behar Legislative Assembly Proceedings
(the 16th March. 1939)

16. Shah Ismail Shaheed
Abdullah Butt Lahore. 1943.

17. Encyclopaedia of Islam:
خاص بلمہارڈٹ Blumhardt کا مقالہ احمد
مارگلیوتھ کا مقالہ Wahhabiya
عبداللہ یوسف علی کا مضمون کرامت علی ہدایت حسین کا مضمون فرائضی

۱۸. ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کا مقالہ Maharaja Ranjit Singh
لیڈر الٰہ آباد ۲۰ رجون ۳۹ء

ڈاکٹر محمود حسین کا مقالہ

۱۹. The Politics of the Indian Wahabis
مارننگ نیوز کلکتہ، عید نمبر ۱۹۴۴ء